تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی عناصر

محقق

کائنات پروین

231-FLL/MSURDU/F17

نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH23349
MS
891.4393
ل11

اردو ادب - افسانہ

پرانی یادیں

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ کائنات پروین رجسٹریشن نمبر 231-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی عناصر"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Kainat Parveen**
Title of the Thesis: الطاف فاطمہ کے افسانوں میں نا سٹلجیائی عناصر
Registration No: **231-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Fozia Aslam
Professor
NUML , Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Najeeba Arif
Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

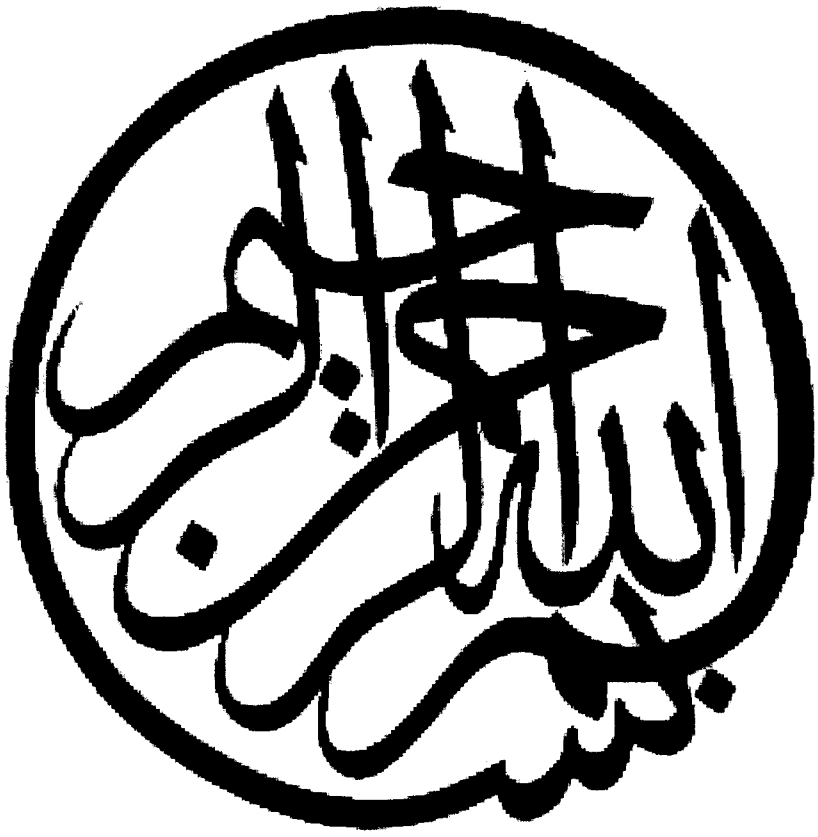
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

اللہ رب العزت کا بہت احسان ہے کہ جس کی دی ہوئی توفیق سے میں مشکلات کے باوجود اس مقالے کو تحریر کرنے کے قابل ہوئی اور اس کی دی ہوئی سمجھ بوجھ سے تکمیل کے مراحل تک پہنچی۔ میرا رب جو بے پناہ حمد و ثناء کے لائق ہے لیکن انسان کے بس میں نہیں کہ اس کا شکر ادا کر سکے۔

اس کے بعد میرے والدین کے لیے میرے دل میں تشکر کے وہ جذبات ہیں جسے بیان کرنا ایک مشکل امر ہے۔ انھوں نے مالی اور اخلاقی طور پر ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور تمام تعلیمی زمانے میں میری کامیابی کے لیے خصوصی دعائیں کرتے رہے اور ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ مقالہ لکھنے میں میرے لیے آسانیاں فراہم کیں۔ سب سے بڑھ کر میرے والد جنھوں نے مجھے یہ یقین دلایا کہ یہ مقالہ میں مکمل کر سکی ہوں۔ صبح شام مجھے ہمت دلائی، میں ان کی بہت ممنون ہوں۔

میرے بہن بھائی جنھوں نے ہمیشہ میری مدد کی اور خصوصاً ہر مرحلے پر ناہید آپی اور بڑے بھائی محمد مبشر اور سلمیٰ آپی نے میری مدد کی۔ میرے لیے ڈھیروں دعائیں کیں۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنے سے میں قاصر ہوں۔

بہت خصوصی شکریہ اپنی محترم اور بہترین استاد ڈاکٹر غلام فریدہ کا، جن کی نگرانی اور رہنمائی کی وجہ سے میں اس مقام تک پہنچی ہوں۔ انھوں نے مقالہ لکھنے میں میری بہت مدد کی، مواد فراہم کیا اور میری غلطیوں پر مجھے ڈانٹنے کی بجائے سمجھایا اور ان کی درستگی کروائی۔ مقالے میں تاخیر کی وجہ سے کبھی کبھی ڈانٹا بھی، لیکن اس ڈانٹ میں ایک پیار بھی تھا۔ اسی وجہ سے میرا مقالہ مکمل ہوا۔ اللہ ان کو ہمیشہ اپنی عافیت میں رکھے (آمین)۔

اس کے بعد محترمہ عاصمہ نذیر کا خصوصی شکریہ جنھوں نے اس مقالے کی تکنیکی مراحل کی تکمیل میں بھرپور ساتھ دیا۔ اللہ ان کو ہمیشہ خوش رکھے (آمین)۔

اس کے بعد میں اپنی عزیز دوستوں آمنہ سید، شمائلہ چوہدری، لبنیٰ نفیس، فرح خلیل، قمر نورین، سعدیہ اور اقراء ممتاز کی شکر گزار ہوں۔ انھوں نے میری ہر طرح سے مکمل مدد کی۔ فوزیہ عنصر جنھوں نے مشکلات کے باوجود مجھے اپنا مقالہ بھیجا اور ڈاکٹر شرافت علی تاشف کا جنھوں نے الطاف فاطمہ پر کام کرنے والوں کے بارے میں خصوصی معلومات دیں اور مختلف مواد فراہم کرنے کے ساتھ ایک گروپ بنایا جس میں الطاف فاطمہ پر کام کرنے والے تمام افراد موجود ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ ان سب کی میں تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ ان سب کو ہمیشہ اپنی عافیت میں رکھے (آمین)۔

کائنات پروین

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	سخن ہائے گفتنی	
۱۔	**باب اوّل:**	
	ناسٹلجیا: فکری اور معنوی مباحث	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	الطاف فاطمہ: احوال و آثار	۳۷
۳۔	**باب سوم:**	
	ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں	۵۶
۴۔	**باب چہارم:**	
	الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا: کرداروں کے تناظر میں	۸۶
	ماحصل	۱۲۳
	کتابیات	۱۳۱

فہرست ابواب

نمبر شمار　　عنوانات

سخن ہائے گفتنی

۱۔ باب اوّل:

۱۔ ناسٹلجیا: فکری اور معنوی مباحث

۱۔۱ ناسٹلجیا کیا ہے؟

۲۔ ناسٹلجیا کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم

۳۔ ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں

۳۔۱ ماضی کی یاد

۳۔۲ یادِ وطن کا عارضہ

۳۔۳ مالیخولیا

۳۔۴ وطن واپسی کی شدید خواہش

۳۔۵ حسرت ناک یادیں

۳۔۶ نفسیاتی بیماری

۳۔۶۔۱ شعور

۳۔۶۔۲ تحت الشعور

۳۔۶۔۳ لاشعور

۳۔۶۔۴ انا

۳۔۶۔۵ فوق الانا

۴۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ادبی صورت حال

۵۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی صورت حال

۶۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو ادب کے مختلف رجحانات

۷۔ تحریک اور رجحان عمومی تعریف

۸۔ نئے ادبی رجحانات اور روایات کا تسلسل

۸۔۱ رومانوی رجحان

۸۔۲ حقیقت پسندانہ رجحان

۸۔۳ تہذیبی رجحان

۸۔۴ علامتی اور استعاراتی رجحان

۸۔۵ جنسی اور نفسیاتی رجحان

۸۔۶ پاکستانی معاشرے کی عکاسی کا رجحان

۸۔۷ سیاسی رجحان

۸۔۸ ناسٹلجیائی رجحان

۸۔۹ آدرشی رجحان

۸۔۱۰ فکاہیہ رجحان

۸۔۱۱ دستاویزی رجحان

۸۔۱۲ خود سوانحی رجحان

۸۔۱۳ رومانی اور عشقیہ رجحان

۸۔۱۴ تجریدی رجحان

۸۔۱۵ محبت کا رجحان

۸۔۱۶ تاریخ کا رجحان

۹۔ ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کی ابتدا

حوالہ جات

۲۔ باب دوم:

الطاف فاطمہ: احوال و آثار

۱۔ تعلیم اور ملازمت

۲۔ عادات و مشاغل

۳۔ تصانیف

۳۔۱ ناول

۳۔۲ افسانوی مجموعے

۳۔۳ تراجم

۳۔۴ ڈرامہ

۳۔۵ تنقید

۳۔۶ جنرل

۳۔۷ وفات

حوالہ جات

۳۔ باب سوم:

ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں

حوالہ جات

۴۔ باب چہارم:

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا: کرداروں کے تناظر میں

حوالہ جات

ماحصل

کتابیات

باب اوّل:

ناسٹلجیا: فکری اور معنوی مباحث

باب اوّل:

ناسٹلجیا: فکری اور معنوی مباحث

ناسٹلجیا کیا ہے؟

ماضی کو لمحہ موجود میں دریافت کرنے کا نام ناسٹلجیا ہے۔ ناسٹلجیا ماضی کی خوشگوار یادوں کا نام ہے۔ ایسی یادیں جن سے حال میں تسکین حاصل ہو۔ فرد خوش ہو، علم نفسیات میں یہ اصطلاح نفسیاتی، ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایسا مرض ہوتا ہے جس میں مریض اپنے حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو ناسٹلجیا حال کی گزشتہ تاریخ ہے جو ماضی کی منتشر، بکھری ہوئی کہانیوں کو واضح اور مضبوط کر کے موجودہ لمحے میں زندہ کرتا ہے۔ یعنی ناسٹلجیا ماضی اور حال کے درمیان داخلی مکالمہ ہے اور اس مکالمے کا نتیجہ ماضی سے محبت ہے۔ حال کی ناآسودگی سے تنگ کر آ کر ماضی کی طرف سفر کرنے کی خواہش جب شدت اختیار کر جائے اور فرد ماضی کی خوشگوار، خوب صورت، حسین یا ناخوشگوار یادوں میں وقت گزارنے میں راحت محسوس کرے تو اس کیفیت کو ناسٹلجیا کا نام دیا جاتا ہے۔

اسٹروینکی (۱۹۶۱ء) کے مطابق، ناسٹلجیا کی اصطلاح پہلی بار جوہائس ہوفر نے ۲۲ جون ۱۶۸۸ء میں پیش کی۔ اس وقت جرمن اصطلاح ہمیسوے کے لیے یونانی لفظ متبادل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب کسی فرد کو اس کے بچپن اور جوانی کے معاشرتی اور جغرافیائی ماحول سے الگ کر دیا تو زبردستی علیحدگی سے پیدا ہونے والی اخلاقی زوال کی کیفیت کو ہوفر نے ایک نیا نام دیا اور یہ ایک کامیاب تجربہ رہا۔ اس کے متبادل دوسرے الفاظ جیسے پوٹھو پیٹریڈ الجیا، ٹوسٹومینیا اور فیلو پیٹریڈومانیہ کو خارج کر دیا۔

ہوفر کو جب یہ معلوم ہوا کہ سوئس فوجی واپس جانا چاہتے ہیں۔ اس خواہش کی وجہ سے وہ نفسیاتی طور پر معذور ہیں اور لڑ بھی نہیں سکتے۔ اس وقت کے بہت سے ڈاکٹروں اور معالجین ہالڈون، ہیورئٹ اور لینڈاؤ نے ناسٹلجیا، پرانی یاد کو "ماضی کی ایک قسم یا ایک قسم کی نفسیاتی بیماری جو مایوسی یا وطن سے دوری کی وجہ قرار دیا تھا۔ لہذا ناسٹلجیا کو اعصابی بیماری یا ۱۷ویں، ۱۸ویں، ۱۹ویں اور بیسویں صدی کی اکثریت کے لیے نفسیاتی عارضہ سمجھا جاتا ہے جو اداسی، بے چینی کا شکار ہو جاتے تھے۔ مرزا غالب نے بھی شاید اسی لیے کہا تھا۔

؎ یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

انسان اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے اور ہمیشہ سے اپنے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ماضی کی یادیں، احساسات، خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا اور بعض انسان تو جیتے ہی ماضی میں ہیں اور یہ سچ ہے کہ ماضی انسان کی زندگی میں حال کو بتانے کا ایک ایسا عمل ہے جس کی بدولت حال کا سفر آسان اور مستقبل کی امید قوی ہو جاتی ہے۔ ہر فرد اپنی زندگی میں سوچے سمجھے بغیر بہت سی کیفیات اور احساسات کو جذباتی طور پر محسوس کرتا ہے۔

ناسٹلجیا سے مراد پرانی یادیں ہیں۔ "یاد" انفرادی شخصیت کی بنیاد پر ہے۔ ہر شخص کو یہ بات معلوم ہے کہ پرانی یادیں کس طرح محسوس ہوتی ہیں لیکن وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ نہ ہی اسے بیان کر سکتا ہے کیونکہ ہم جذبات کو محسوس تو کر سکتے ہیں لیکن بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یاد کا تعلق ماضی سے ہے کیونکہ ہر گزرا ہوا وقت ماضی میں شمار ہوتا ہے۔ ماضی کی خوشگوار یادوں سے حال اور مستقبل خوشگوار لمحوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ قاضی جاوید نے ناسٹلجیا کے حوالے سے مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ بقول قاضی جاوید:

> بہت سے دوسرے خیالات اور احساسات کی طرح ناسٹلجیا کا احساس بھی ہماری سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہمیں ماضی کے لمحوں اور مقامات میں سے ایسے اجزا تلاش کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو ہماری موجودہ صورتحال کی ناگواری کا مداوا کر سکے۔[1]

ناسٹلجیا کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن ناسٹلجیا کی وضاحت کرنے میں ایک مشکل یہ ہے کہ تاریخ کے توسط سے اس لفظ کے معنی کو تبدیل کیا گیا۔ جین اسٹار سینکی "پرانی یادوں کا نظریہ" (۱۹۶۶ء) میں کہتے ہیں کہ جذبات اور ذہنیت کی تاریخ کا پتہ لگانے میں کسی کو فوری طور پر جذبات اور زبان کے آپس میں پائے جانے والے طریقہ کار کے ایک سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کا تعلق کس ثقافت سے ہے؟

یاد انفرادی شخصیت کی بنیاد ہے۔ یادداشت کا تعلق ماضی سے ہے کیونکہ اگر یادداشت نہ ہو تو ماضی کہاں رہتا ہے؟ ماضی کے بغیر حال اور مستقبل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آج ہمارا حال کل کا مستقبل ہے جس طرح ہم آج کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ماضی نے حال و مستقبل کے روشن امکانات کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ گویا ماضی، حال اور مستقبل تینوں اجزاء ایک ہی سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ اسی حوالے سے انتظار حسین کہتے ہیں کہ:

> حافظہ نہ ہو تو ماضی کا عرفان کیا اور ماضی کا عرفان نہ ہو تو حال و مستقبل کی حد بندی ہی کیا۔ یہ عمل ظاہر ہے محض ایک غیر محدود، بے نام و نشاں سے حال میں زیست کرنے سے جاری ہو سکتا ہے نہ حاصل۔[2]

ناسٹلجیا سے مراد ہماری وہ پرانی یادیں ہیں جو ہمیں خوش کرتی ہیں۔ تو بیک وقت اداس بھی کر دیتی ہیں۔

خوبصورت لمحوں کو یاد کر کے ہم خوش ہو جاتے ہیں اور اسی ماضی میں لوٹ جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہ بہت خوبصورت اور دلچسپ جذبات واحساسات ہوتے ہیں اور جب ہم ماضی میں لوٹ نہیں سکتے تو یہ یادیں ہمیں رلا بھی دیتی ہیں۔ کیونکہ ماضی، حال سے مختلف ہوتا ہے۔ حال کتنا ہی شاندار اور خوبصورت نہ ہو فرد ماضی کو یاد ضرور کرتا ہے۔ وہ ماضی سے نہیں نکل سکتا۔

قیامِ پاکستان کے عمل نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف حال و مستقبل کا پتہ دیا بلکہ فرد کے اندر ماضی کی تلاش اور اپنے احساسات کو سمجھنے کی خواہش کو جنم دیا۔ اس خواہش سے پہلی بار ادب میں حب الوطنی، قوم پرستی اور معاشرتی اصلاح کے موضوعات وجود میں آئے۔ ان موضوعات کے علاوہ ادب میں ایک نیا موضوع ناسٹلجیا سامنے آیا۔ جسے موضوع یا رجحان کہا جاسکتا ہے۔ اس رجحان کی بنیاد ہجرت کے تجربے پر تھی۔ وہ ادیب جن کی ذات کا کوئی حصہ ماضی میں کٹ کر رہ گیا تھا۔ ہجرت کے بعد اس احساس کی وجہ سے ان ادیبوں کے ہاں ناسٹلجیا کا موضوع در آیا کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک خوبصورت حصہ جسے بچپن کہا جاتا ہے، برصغیر میں گزارا تھا۔

ادیب اپنے ماضی کو نہ صرف یاد کرتے بلکہ اپنی تحریروں میں اس احساس کو بیان بھی کرتے۔ موجودہ معاشرہ ماضی کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ معاشرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ماضی کے کیے ہوئے حصے کو تخیل کی مدد سے واپس لا کر ذات میں نہ سمویا جائے۔ ادیب بار بار اس چیز کو بیان کرتے ہیں کہ زمانہ صرف حال اور مستقبل نہیں بلکہ ماضی بھی ہے۔ ماضی کے بغیر حال اور مستقبل ادھورے ہیں۔ یہ تینوں زمانے آپس میں پیوست ہیں۔ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی حال میں موجود ہے۔ حال میں رہتا ہے۔ حال میں زندہ ہے۔ اسی میں سانس لیتا ہے لیکن اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ ماضی کے بغیر حال کی کوئی صورت نہیں۔ اس لیے ہجرت کر کے آنے والے ادیبوں کے ہاں ماضی کا احساس زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کا ماضی زندہ اور جاندار صورت میں ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ بقول روبینہ الماس:

> ماضی کی بازآفرینی کا شدت سے استعمال قراۃ العین اور انتظار حسین کے یہاں ملتا ہے۔[۳]

ماضی کو شدت سے یاد کرنا، اس میں گم رہنا ناسٹلجیا ہے۔ ماضی پرستی کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی آبِ گم میں بیان کرتے ہیں کہ:

> اس مجموعے (آبِ گم) کے بیشتر کردار ماضی پرست، ماضی زدہ اور مردم گزیدہ ہیں۔ ان کا اصل مرض ناسٹلجیا ہے۔ جب انسان کو ماضی حال سے زیادہ پرکشش نظر آنے لگے اور مستقبل نظر آنا ہی بند ہو جائے تو باور کرنا چاہیے کہ وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ بڑھاپے کا جان لیوا حملہ کسی بھی عمر

میں۔۔۔۔ بالخصوص بھری جوانی میں بھی ہو سکتا ہے۔[۴]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ناسٹلجیا" ماضی کی خوشگوار یادوں کا استعارہ ہے۔ پرانے دنوں کی یادیں اچھی اور بری دنوں ہو سکتی ہیں۔ پرانے دنوں کو یاد کر کے فرد کے جو جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔ ناسٹلجیا ماضی کا حسین عکس لیے مریض کا پیچھا کرتا ہے اور پھر اچانک سے اس کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔

ناسٹلجیا کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم:

ناسٹلجیا یونانی زبان کا لفظ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ Notos اور Algos۔

ناسٹلجیا = ناس +ٹل+جیا

Notos سے مراد ہے گھر کو واپسی To Return Home اور Algos کے معنی ہیں۔

کرب یا درد To pain۔[۵]

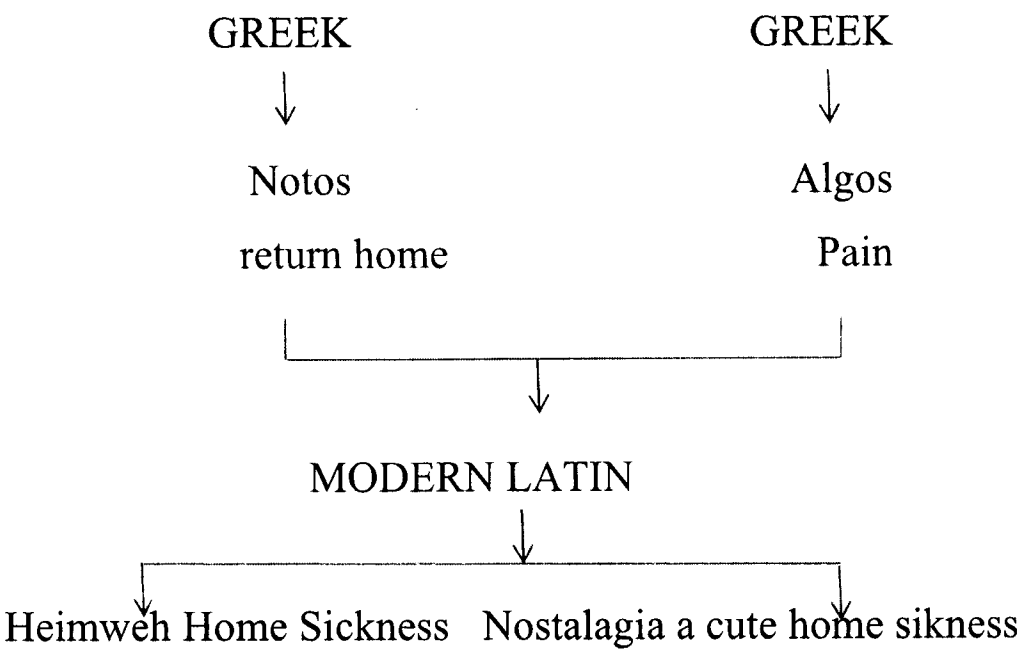

ناسٹلجیا کی ایک اور تعریف:

Nostalagia is like a grammer lesson. You find the present tense, but the past perfect owns fee pomerary.[۶]

یعنی ناسٹلجیا گرامر کے اس سبق کی طرح ہے جس میں آپ ماضی مکمل کی صورت میں حال مطلق میں ہوتے ہیں۔

A feeling of pleasure and also slight sortness when your think about the things that happended in the past.[۷]

ناسٹلجیا ماضی میں وقوع پذیر ہونے والی خوشگوار یا ناخوشگوار یادوں کا نام ہے۔اس بات کو ویکیپیڈیا میں ایک اور انداز میں لکھا گیا ہے۔

> Nostalagia is the good feeling you get when remember things from your past. When you kind of sit back the smile and think to yourself. Wow, that was fun or happy.[۸]

پس کہا جاسکتا ہے کہ ناسٹلجیا حسین یادوں کا وہ خوشگوار احساس ہے جو انسانی ذہن کے دریچوں میں خوشی و شادمانی کے ان مسرت بخش لمحات کو جنم دیتا ہے جن سے وہ بھرپور حظ اٹھاتا ہے۔

ویبسٹر ڈاٹ کام ڈکشنری "ناسٹلجیا" کی تفہیم اس انداز میں کرتی ہے کہ:

> Pleasure and sadness that is casual by remembering something from the past and wishing that you could experience it again.[۹]

مطلب ناسٹلجیا راحت و غم کا وہ منفرد احساس ہے جس کی تذکیر اور اس سے دوبارہ گزرنے کی خواہش پر کبھی خزاں نہیں آتی۔

ایڈوانس پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں۔

> Nostalagia: N. Home sickness.[۱۰]

وطن یا گھر سے دور، وطن یا گھر کی یاد، یادِ وطن کا عارضہ، وطن واپس جانے کی خواہش، ماضی پرستی۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ناسٹلجیا کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

> A sentimental loging or wistful affection for a period in the past.[۱۱]

یعنی ماضی سے وابستہ حسرت ناک یادیں ناسٹلجیا ہے۔

اربن ڈکشنری Urban Dictionary کے مطابق:

> A bitter sweet longing for theings, persons or situation of the past.[۱۲]

ماضی سے منسلک کی ہوئی چیز یا حالات و حوادث کی ناخوشگوار میٹھی یادیں جن سے شخص کا چھٹکارا ممکن نہ ہو۔

آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں ناسٹلجیا سے مراد ہے کہ:

ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی شے یا اشیا، گھر کی یاد، گھر سے دور کا شدید احساس۔[13]

Allencaintkyڈاٹ کام نے ناسٹلجیا کو پرانی بیماری قرار دیا ہے۔

Nostalagia: A wistful desire to return in thought or in fact to a former time in ones family and friend; a sentimental yearring for the happiness of a former place or time, a nostalagia for his college days.[14]

یعنی ماضی پرستی دراصل ماضی کی طرف لوٹ جانے کا، کسی فرد کی وہ خواہش ہے جو گھر، وطن، خاندان یا دوستوں کی جدائی میں نمو پذیر ہوتی ہے جو وقت اور لمحے اس نے ماضی میں خاندان، دوستوں اور مسکن میں گزارے ہیں، کی طرف واپس پلٹ جانے کی امنگ۔ مثال کے طور پر کالج یا سکول میں بیتے دنوں کو یاد کرنا ناسٹلجیا کہا جاتا ہے۔

ہولینڈ کے مطابق:

Nostalagia can be enthralling blinsing us to immediate concerns through headly and potentially treacherous.[15]

ہولینڈ کے مطابق ناسٹلجیا سحر انگیز خیال پیدا کرتا ہے جو انسان کو عصرِ حاضر کی تلخیوں سے باخبر کرتا ہے جبکہ ہوسیل کے مطابق یہ حقیقت سے بلند کوئی صورت ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

Nostalagia seemed to be connected to an over active imagination.[16]

پریکٹیکل ڈکشنری میں ناسٹلجیا کے معنی ہیں کہ:

Nostalagia describes a longing for the past often in idealized form. Nostalagia may or may not also be known as home sickness.[17]

ایک اور مغربی ادیب لیش ناسٹلجیا کو دائمی آگ کا شعلہ قرار دیتا ہے جو اپنے دھیمے انداز میں تسلسل کے ساتھ سلگ رہا ہے۔ جس کی اذیت اور پیش نظر نہ آتے ہوئے بھی بندے کو بھسم کر جاتا ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ

A Persistant law level but omnipresent irritant that can not be curred.[18]

سائیکالوجی کی لغت میں بھی ناسٹلجیا کی تعریف کی گئی ہے۔ لوئتھل کے مطابق:

Nostalagia tells it like it was not in the imagined past.[19]

عاصم بٹ ناسٹلجیا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ناسٹلجیا خود کو دہرانے کی خواہش کا نام ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد اپنے ماضی کی طرف لوٹنے کا عمل ہے۔ ماضی سے مراد اپنا وہ سب کچھ جو ہو چکا ہے اور وہ سب کچھ جو پہلے سمجھا۔ اس کی طرف لوٹنے کی خواہش ناسٹلجیا ہے۔[20]

اردو ادب کے ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی (جن کے افسانوں کے کئی کرداروں کے ہاں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ اس کیفیت کو انھوں نے بہت سے نام جیسے بادش بخیریا، ماضی گیراں اور کبھی یاد تمنائی کا نام دیتے ہیں) ناسٹلجیا کو ایک خوب صورت مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ :

ماضی گیراں ماضی کو پکڑ کر بیٹھ جانے والے لوگ تمنائی۔۔۔۔ پاستاں طرازی کے پس منظر میں مجروح انا کا طاؤس رقص دیدنی ہوتا ہے۔ مور فقط اپنا ناچ ہی نہیں، اپنا جنگل خود پیدا کرتا ہے۔ ناچتے ناچتے ایک طلسماتی لمحہ ایسا آتا ہے کہ سارا جنگل ناچنے لگتا ہے اور مور خاموش کھڑا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناسٹلجیا لمحہ منجمد کی داستان ہے۔[21]

احمد سہیل ناسٹلجیا کی تعریف کچھ اس انداز میں کرتے ہیں کہ :

ناسٹلجیا کا مفہوم غالباً ہمارے یہاں "خانہ اداسی" سے لیا جاتا ہے جو یکسر غلط ہے۔ خانہ اداسی سے مراد Home sickness ہے۔ یہ کہ ناسٹلجیا جو بظاہر (لاطینی لفظ معلوم ہوتا ہے) حقیقتاً دو یونانی لفظ Notos بمعنی "واپسی" اور Algos جس کے معنی "درد" کے ہیں۔۔۔۔۔ سے مل کر بنا ہے۔ لفظی طور پر ناسٹلجیا کے معنی "درد آلود واپسی" ہوگا۔[22]

اردو ناول کے ممتاز محقق ممتاز حسین اس کی تعریف انتہائی سادہ اور دوٹوک الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

گھر کو لوٹ جانے کی شدید خواہش ناسٹلجیا ہے۔[23]

ایک اور جگہ ممتاز احمد خان اس بات کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ :

ناسٹلجیا ایک مثبت طرزِ احساس ہے۔۔۔۔ ناسٹلجیا یادیں کبھی جدا نہیں ہو سکتیں۔ کیوں کہ یہ فطرت انسانی کا خاصا ہے۔۔۔۔ یہ سوال یہ یہ مریضانہ اور منفی جذبہ تو نہیں تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسا قطعی نہیں۔[24]

پس ناسٹلجیا ایک ایسا فطری رویہ ہے جس سے فرد حال میں ماضی کو دیکھ سکتا ہے۔ ماضی کی تصویر حال میں نظر آتی ہے اور جس میں ماضی کو شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور کردار ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے تاکہ حال کی ناآسودگی کو ماضی کی خوب صورت یادوں کے سہارے سکھ، چین اور آرام میں بدل سکے۔

نفسیات کی اصطلاح میں ناسٹلجیا کو ایک بیماری کا نام دیا گیا ہے جس میں فرد گھر سے دور ہو کر ایک نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے لیکن اس سب کو فرد کبھی بھی خوشی سے نہیں اپناتا یعنی ناسٹلجیا اس کیفیت کا نام ہے جس میں غریب الوطنی کے کرب اور نئے ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش پر ناکامی کا احساس جب انسان کو بے بسی کے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے تو اس وقت کے معمولات میں یادِ تمنائی میں مبتلا شخص ہر لمحہ، ہر ساعت اپنے افراد، گزرے وقت میں درپیش حالات و واقعات کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ وطن سے جدائی کی شدت جب انتہائی حدوں کو چھونے لگے تو ضرور ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ واپس اپنے وطن کی طرف جانے کی خواہش کرتا ہے۔ اس نئے ماحول میں وہ خود کو الگ، اجنبی محسوس کر کے رجعت پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان افراد کے ہاں ناسٹلجیا ایک منفی جذبہ بن کر سامنے آتا ہے لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ ایک مثبت پہلو رکھتا ہے جس میں ماضی کی تخلیقی بازیافت ہے جو تخلیق کار کی کوششوں سے معاشرے کی از سرِ نو تعمیر و تشکیل کی شدید خواہش بن کر ابھرتا ہے اور اس کے پس منظر میں حسب و نسب کی شناخت، انفرادی برتری اور خاندان و نسل کو قابلِ فخر بنانے کی شعوری کاوش بھی ہے۔

ناسٹلجیا زیادہ تر ان ادیبوں کے ہاں نظر آتا ہے جنھوں نے برصغیر سے ہجرت کی تھی۔ برصغیر میں ایک خوب صورت وقت گزارنے کے بعد تقسیم کی وجہ سے اس علاقے میں سیاسی اور مذہبی طور پر پیدا ہونے والی انسانی صورت حال کی کرب انگیزی کو محسوس کیا کیونکہ انسانی نقل مکانی جو خالص مذہبی بنیادوں پر تھی، اس کو ہجرت کا نام دیا گیا جو اس جغرافیائی حرکت پذیری کا غلط تصور ہے کیونکہ ہجرت کرنے والے مہاجر واپس جانے کے لیے کسی خاص جغرافیائی علاقے میں سفر کرتا ہے مگر پاکستان کے جن لوگوں نے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان نقل مکانی کی وہ نئے علاقوں میں واپس نہ جانے کے لیے تھے۔ نوجوان نسل کو الگ وطن حاصل کرنے کی خوشی تھی مگر ادیب جو ہمارے معاشرے کے احساس فرد ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارا تھا۔ خوبصورت یادیں یہاں سے جڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کے لیے سب کو چھوڑنا اور ہجرت کرنا ایک مشکل امر تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے کیونکہ وہ اس نقل مکانی کو "ہجرت" کی اصطلاح میں بدل کر پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان جانے والوں کو اپنی اپنی زمین پر ایک قسم کی "تہذیبی جلاوطنی" میں مبتلا کر دیا۔

ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں:

۱۔ماضی کی یاد ۲۔یاد وطن کا عارضہ

۳۔مالیخولیا ۴۔وطن واپسی کی شدید خواہش

۵۔حسرت ناک کی یادیں ۶۔نفسیاتی بیماری

۱۔ماضی کی یاد:

یاد ماضی سے مراد گزرے ہوئے وقت کی یاد ہے۔ایسا وقت جو گزر چکا ہے۔اس وقت کی یادیں انسان کی زندگی میں ہمیشہ رہتی ہیں۔ گزرے ہوئے لمحے کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسان کے وجود پر اس کے ماضی کی پرچھائیاں پڑی رہتی ہیں۔اور آئندہ آنے والی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

زمانے تین ہیں۔ماضی، حال اور مستقبل۔آج کا حال مستقبل کا ماضی ہے۔ماضی کے بغیر انسان آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کوئی بھی معاشرہ جائے۔ماضی کے بغیر حال اور مستقبل کچھ بھی نہیں ہے۔ معاشرے کی طرح انسانی شخصیت بھی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اپنے ماضی کو یاد نہ کرے۔ اپنے حال میں ماضی کو شامل نہ کرے۔ گزرے ہوئے ماضی کو تخیل کی مدد سے واپس لا کر ذات میں سمویا جائے۔انسان کی پہچان اس کے ماضی سے ہے کیونکہ افراد کا تشخص ان کے ماضی میں چھپا ہوتا ہے۔

ماضی کی یاد سے مراد پرانی یاد ہے۔ جسے اس فرد نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ جو آج اس کے پاس موجود نہیں ہے۔ یاد سے مراد خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ایسی خواہش جو ماضی میں پوری نہ ہوئی ہو اور آج انسان صرف اسے یاد کر سکتا ہے۔ ماضی کو زندہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن حال میں ماضی کو یاد کر کے انسان خوش ہو سکتا ہے اس لحاظ سے یہ یاداشت نہیں بلکہ ایک ماضی ہے جسے ایک مریض ماضی کی طرف دیکھتا ہے۔ کیونکہ ماضی کا مطلب سلامتی ہے۔

لوگ ذاتی بحرانوں یا قومی عدم استحکام کے اوقات میں پرانی یادوں کا زیادہ تجربہ کرتے ہیں۔ نفسیاتی لحاظ سے انفرادی بحران شناخت کے بحرانوں جیسے اوقات میں پائے جاتے ہیں۔ جوانی، ابتدائی جوانی، ادھیڑ عمر اور بڑھاپے۔ انسانی جوانی میں بچپن اور بڑھاپے میں جوانی کو یاد کرتا ہے۔ اور اکثر اس میں لوٹ جانے کی خواہش کرتا ہے۔ یہی یاد ماضی ہے۔ بوڑھے لوگ جوانوں سے زیادہ ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ اور یہ سب قدرتی طور پر ہے۔ کیونکہ نوجوان افراد روزمرہ کی مصرفیات سے دوچار ہیں۔ اس لے ماضی میں زیادہ دلچسپی نہیں۔ لیکن فارغ وقت میں وہ ماضی کو یاد کر کے سکون محسوس کر سکتے ہیں۔ بوڑھے لوگوں کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ یہ مرد اور خواتین عمل سے اکتا چکے ہیں۔ اس لیے

حال سے منہ موڑ کر ماضی میں پناہ لیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو ماضی کے خوبصورت قصے سناتے ہیں۔

بعض افراد میموری اور پرانی یادوں کو ایک ہی چیز تصور کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مختلف مظاہر ہیں۔ پرانی یادوں اور میموری کے مابین الجھن اکثر اس حقیقت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ پرانی یادوں میں شامل نہیں ہوتی ہے میموری میں یاد یاد فلیش بیک یا مثالی بنانے، فراموش کرنے مہم ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ میموری اور پرانی یادوں کے درمیان اہم فرق یہ ہے کہ میموری کو عکاسی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ جبکہ پرانی یادوں میں یہ خود بخود شامل ہو جاتی ہے۔ گویا افراد کا تشخص ان کے ماضی میں چھپا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ممر رئیس کا کہنا ہے کہ

قوموں کا تہذیبی تشخص ان کی تاریخ میں اور افراد کا تشخص ان کے ماضی میں پنہاں ہوتا ہے۔[۲۵]

چونکہ ہر گزرتا لمحہ ماضی میں بدلتا جاتا ہے اس لحاظ سے انسان حال میں زندہ رہتا ہے۔ لیکن اس کی جڑیں ماضی سے جڑی ہوتی ہے۔ یاداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے۔ یاداشت نہ ہو تو ماضی بھی نہیں رہتا۔ اور ماضی نہ ہو تو بنیاد اور جڑیں بھی نہیں رہتیں گویا ماضی کی انسان زندگی میں بہت اہمیت ہے۔

۲۔ یادِ وطن کا عارضہ:

نا سٹلجیا کی ایک اور صورت یاد وطن کا عارضہ ہے۔ اس میں فرد اپنے وطن کو یاد کرتا ہے۔ اپنے وطن سے پیار کرتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جو لوگ ہجرت کے کرے بر صغیر سے پاکستان آئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا لمبا عرصہ بر صغیر میں گزارا تھا۔ انھیں بر صغیر سے اس کی گلیوں سے پیار تھا۔ ان کے لیے یہاں سے جانا مشکل امر تھا۔ لیکن جب یہ لوگ پاکستان آئے۔ تو نوجوان تو نئے ملک کو حاصل کر کے خوش تھے۔ لیکن بوڑھے افراد کے یاد وطن کا عارضہ نظر آتا ہے۔

ادیبوں کی تحریروں میں یہ دکھ نظر آتا ہے۔ ان کے دوست بچھڑے ہوئے عزیز جن میں سے اکثر بچے سے جوان، جوان سے بوڑھے اور اہل وعیال والے ہو گئے تھے۔ ان کی یاد ستائی تھی۔

جوان ادیبوں کے ہاں اس بات کی خوشی نظر آتی ہے۔ لیکن بزرگ ادیبوں کو اپنے عزیزوں سے بچھڑنے کا بہت غم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے سب کا نقصان ہوا ہے۔ اپنے اپنوں سے بچھڑ گے ہیں۔

بر صغیر میں ان کا گھر تھا۔ گھر کا مطلب صرف وہی جگہ نہیں جہاں کسی کا کنبہ رہتا ہے۔ بلکہ مختلف خیالات اور احساسات جیسے تحفظ معاشرتی شناخت، جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ادیبوں کا تقسیم کا بہت دکھ تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں میں یاد وطن کا دوستوں، عزیزوں کا ٹولا بچھڑ گیا۔ وہاں صرف چند مکان رہ گئے جو کہنے کو مکان لیکن وہ صرف کھلنڈر رتھے۔ یہ سب دکھ ان کے اندر دن بدن بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس لیے ان ادیبوں کی تحریروں میں یاد وطن کا عارضہ

جابجا نظر آتا ہے۔

۳۔مالیخولیا:

ناسٹلجیا کی ایک اور صورت مالیخولیا ہے۔مالیخولیا ایک بیماری کا نام ہے جس میں فرد کے اندر وطن سے دوری کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح وطن کو یاد کر کے عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔۔اسی طرح وطن سے دوری کے شدید احساس کے نتیجے میں جو عارضہ لاحق ہوتا ہے۔اسے مالیخولیا کہتے ہیں۔

مالیخولیا کے معنی جنونی، دماغی بیماری ہے۔وطن سے دوری کی وجہ سے انسان اداس یا پریشان ہو کر سودائی سا ہو جاتا ہے۔فرد کو وہم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

مالیخولیا انگلش زبان کے لفظ Melancholia سے نکلا ہے۔اس کے معنی اداسی، دل شکستگی خفقاں و حشت ہے گہری اداسی کا احساس ہے۔

ادیب جب ہجرت کے کے پاکستان آئے ہو بر صغیر کو یاد کر کے اداس ہو جاتے۔انھیں اپنا وطن شدت سے یاد آتا۔جس کی وجہ سے ان کے اندر مالیخولیا کی صورت نظر آتی ہے۔

۴۔وطن واپسی کی شدید خواہش:

نا سٹلجیا کی ایک صورت ان سپاہیوں کی وطن جانے کی خواہش کے حوالے سے ہے۔جو ماضی میں دل شکستگی اور اداسی کا شکار ہو جاتے تھے۔جونس ہافر نے نا سٹلجیا کا لفظ پہلی بار ۱۶۸۸ء وطن واپس جانے کی خواہش یا درد آلود واپسی کے طور پر متعارف کروایا۔ازاں بعد جوزف بنکس نے کہا:

> By 1850's Nostalagia was losing its status as a particular disease and coming to be seen rather in 1st and 2nd world war still being recognized.[۲۶]

۵۔حسرت ناک یادیں:

ناسٹلجیا کی ایک اور صورت حسرت ناک یادیں ہیں۔فرد جب اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔حال کو دیکھ کر ماضی میں کھو جاتا ہے۔اور ماضی میں لوٹ جانے کی خواہش کرتا ہے۔فرد ماضی کو یاد کر کے خوش ہوتا ہے۔جب ماضی میں واپس لوٹ نہیں سکتا تو غمگیں ہو جاتا ہے۔حسرت ناک یادوں کو سوچ کر افسردہ ہو جاتا ہے۔وقت تو تبدیل ہو جاتا ہے۔لیکن نہ فرد خود تبدیل ہوتا ہے۔نہ اس کی یادیں لیکن جب ان یادوں کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔تو یہ یادیں حسرت ناک یادیں کہلاتی ہیں۔

۶۔ نفسیاتی بیماری:

ادب اور نفسیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ دونوں کا تعلق ذہن انسانی سے ہے۔ لفظ Psychology یونانی زبان کے الفاظ (psyche) (soul)اور (science)کا مرکب ہے۔ اس لیے اس کا مطلب روح کی سائنس یا مطالعہ ہے۔ انسانی نظریہ تحلیل نفسی موجودہ دور کا حیرت انگیز انکشاف ہے۔ فرائڈ پہلا ماہر نفسیات ہے۔ جس نے انسانی شخصیت کے لاشعور کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ اس کے نظریے کے مطابق انسانی شخصیت کا زیادہ حصہ اس کے لاشعور میں دفن رہتا ہے۔ اس نے ذہن کو ایک آئس برگ سے تشبیہ دی جس کا زیادہ حصہ سمندر میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور معمولی حصہ سطح کے اوپر نمایاں ہوتا ہے۔

فرائڈ کے مطابق ہم انسانی شخصیت کا مطالعہ اس کے ظاہری افعال کے ذریعے نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کی دبی ہوئی آرزوئیں، احساسات اور خیالات لاشعور سے مسلسل اس کے کردار کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ فرائڈ کے ذہنی عمل کے تین مدارج بیان کئے ہیں۔

۱۔ شعور

۲۔ تحت الشعور

۳۔ لاشعور

شعور کا تعلق ان اعمال سے ہے جن سے ہم کسی زیر بحث وقت میں پورے طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔ تحت الشعور۔ شعور اور لاشعور کی درمیانی منزل ہے۔ اور یہ ان تجربات کا مجموعہ ہے۔ جن سے کوشش اور توجہ سے آگائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور لاشعور وہ درجہ ہے جس سے ہم بالکل ناواقف ہیں اور وہ سوائے خصوصی حالات کے ہمارے لیے قابل رسائی بھی نہیں۔

انسان کی زندگی میں ہزاروں خواہشات وقت کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ وہ خواہشات پوری بھی ہوں۔ اس لیے غالب فرماتے ہیں۔

؎ ہزاروں خواہشیں ایسی کے ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

انسان کی تمام خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور پوری نہ ہونے والی خواہشات کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تحت الشعور میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس سے ذہنی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا ذہن بے چین رہتا ہے۔ یہ خواہشات کبھی انسان کے خوابوں کے ذریعے اور کبھی انسان کی مختلف حرکات و سکنات کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔

فرائڈ کے مطابق سائیکی کی ساخت تین مدارج پر مشتمل ہے۔ لاذات (Id) انا اور فوق الانا، ضمیر لاذات یہ ان تمام خواہشات کا مرقع ہے۔ جو پیدائش کے وقت انسان ورثہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی فرد کی تمام ذہنی توانائیوں کا ذریعہ ہے۔ یہ فلسفہ لذئیت کے اصول کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس میں تمام افعال لاشعوری طور پر ہوتے ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ افعال جبلی ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت کے احساس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ دبی ہوئی آرزوؤں، جذبات اور خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ غیر منطقی ہوتے ہیں اور جنسی خواہشات سے بھرپور ہوتے ہیں۔

انا(Ego):

انا کے تحت ظہور پذیر افعال زیادہ تر شعوری ہوتے ہیں۔ منطقی ہوتے ہیں۔ اور ماحولیاتی حقائق سے مطابقت رکھتے ہیں۔

فوق الانا، ضمیر(Super Ego) :

ضمیر کے زیر اثر افعال ان اثرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جو فرد پر والدین، معاشرے اور دوسرے افراد کی طرف سے پڑتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید فرائیڈ کے نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> فرائڈ کا بنیادی نظریہ جنسی قوت یا LIBIDO پر مبنی ہے۔ اڈ ID نفس قوت کا سرچشمہ ہے۔ اسے معروفی حیثیت کا علم تک نہیں ہوتا۔ یہ انسانی تجربے کے بارے میں صرف یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ درد بخشتا ہے یا لذت۔ اڈ کے دائرے کے اندر ایگو اور سپر ایگو ایک دوسرے سے متمیز ہوتے ہیں۔ ان میں ایگو ذہن کے اندر کی اشیاء کو خارجی دنیا کی اشیاء سے متمیز کرتا ہے۔ تجربے کے بارے میں ایگو صرف یہ پوچھتا ہے کہ وہ سچ یا جھوٹ۔ ایگو جبلی ضروریات اور خارجی ماحول میں گویا رابطہ قائم کرتا ہے۔ سپر ایگو معاشرے کے اقدار کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ گویا شخصیت کا اخلاقی پہلو ہے۔ اور تجربے کے بارے میں صرف یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ اچھا ہے یا برا۔[۲۷]

قیام پاکستان:

اردو دنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ہے۔ اس کے بارے میں مختلف نظریات بیان کئے گئے۔ اردو ادب کا باقاعدہ آغاز داستان سے ہوتا ہے۔ کہانی سننا اور کہنا ہمیشہ انسانوں کو مرغوب رہا ہے۔ روز مرہ معمولات کی تھکاوٹ کو ختم کرنے کے لیے داستان کو وسیلہ بنایا گیا۔ داستانوں میں مافوق الفطرت اشیاء، واقعات اور مقامات کی کثرت ہوتی ہے۔

آرائش محفل، رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب اور انشااللہ خان انشا کی، رانی کیتکی کی کہانی مصروف وقت کے بدلتے تقاضوں کے سب اردو ادب میں ایک نئی صنف وجود میں آتی اسے ناول کہتے ہیں۔ اس میں انسانی زندگی کے معمول کے واقعات اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی داستان کی طرح آغاز، عروج اور انجام ہوتا ہے۔ اس میں لازمی طور پر زمانی اور مکانی وحدت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مگر اب ناول کے پلاٹ کا یہ تصور اس حوالے سے میکانکی سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسانی شعور کی ان پیچیدگیوں کے اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو کرداروں کی شخصیت اور واقعات کے بہاؤ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی چیز ناول کو اس کی تکنیک تک لے آیا جسے شعور کی رو کہتے ہیں۔ اس تکنیک میں زمانی ترتیب کو توڑ دیا جاتا ہے اور کہانی خط مستقیم پر آگے بڑھنے کے بجائے وقت کے ایک ایسے کلیا دوران میں چلتی ہے۔ جہاں ماضی، حال اور مستقبل ذہنی کیفیات کے سوا کچھ نہیں رہ جاتے اور کردار لمحہ موجود میں سانس لینے کے باوجود زمانی حد بندیوں کو مٹاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قراۃ العین حیدر کا آگ کا دریا ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، خدیجہ مستور کا آنگن، جیلہ ہاشمی کا دشت سوس، فضل احمد کریم فضلی کا خون جگر ہونے تک، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اور بانو قدسیہ کا راجہ گدھ اہم ہیں۔

سیاسی، سماجی، معاشی، تمدنی، مذہبی اور ادبی تمام پہلوؤں سے ۱۸۵۷ء کا سال برصغیر کی تاریخ برصغیر کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہی برصغیر سے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ آزادی کی ناکامی ہندوستان کی تعلیم یافتہ قیادت اور مسلمان رہنمانوں کے لیے ایک شدید صدمہ تھا۔ جس سے ان کو احساس ہوا کہ اگر وہ جدید دور کے نئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکے تو یہ حقیقت قوم ان کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس جنگ نے صرف سیاسی انقلاب ہی برپا نہیں کیا بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کے معیار میں بھی تبدیلی آئی۔ اس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ جنگ آزادی نے یہ بات واضح کر دی کہ ہماری کمزوری زندگی سے دوری ہے۔ انسان کے اندر شعور کے پیدا ہوتے ہی اصلاحات کی ابتدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے اردو فکشن کی تاریخ میں انیسویں صدی سیاسی و تہذیبی کروٹوں کی صدی ہے۔ یہ دور برصغیر کی ادبی و فکری تاریخ کے لیے غیر معمولی دور تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء سے کا اردو ادب اسی عہد اصلاح کا ادب ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں صرف ایک سیاسی انقلاب نہ تھا۔ بلکہ ایک تہذیبی انقلاب تھا۔ اس سے برصغیر میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور اقتدار کے ساتھ اس تہذیب و تمدن کی برتری بھی ختم ہو

ہندوئوں نے بھی مسلمانوں کا معاشی استحصال شروع کر دیا۔ ان حالات میں بر صغیر پاک و ہند میں تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک بنیادی طور پر تعلیمی و اصلاحی تحریک تھی۔ انھوں نے ایک ادبی رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا۔ سر سید کے ساتھیوں نے بھی اس عمل میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ مولانا محمد حسین آزاد مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور مولانا نزیر احمد اس حلقے کے ممتاز رکن ہیں۔

سر سید کے دوستوں میں سے مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ کو ایک نئے رنگ سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی کتابوں میں الفاروق ، المامون، اور سیرت النبی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ نذیر احمد نے اردو ناول نگاری کا آغاز سے اردو ادب میں ناول کی صنف کو متعارف کروایا۔ مراۃ العروس ، بنات النعش ، توبتہ النصوح اور ابن الوقت ان کے مشہور ناول ہیں ان کے ناول مقصدی ہیں اور اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا حالی نے اپنے شعری نظریات اور خیالات کو مقدمہ شعر و شاعری، تنقید کی کتاب میں بیان کیا۔ انھوں نے حیات جاوید ، حیات سعدی اور یادگار غالب لکھ کر اردو میں سوانح عمریاں لکھنے کا آغاز کیا۔

اس دور کے نمائندہ ناول نگاروں میں ڈپٹی نذیر احمد، سر شار اور شرر شامل ہیں۔ ان ناولوں نگاروں کے ہاں تہذیبی اور مذہبی تصادم و تفاوت صاف نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اصلاح کی لہریں بھی موجود ہیں کیونکہ یہ اپنی تحریروں سے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ نذیر احمد ایک طرف طبقہ نسواں کی اصلاح کرتے ہیں اور دوسری طرف ابن الوقتی کا درس دیتے ہیں۔ سر شار کا مشہور ناول فسانہ آزاد ہے۔ اس میں اس عہد کے لکھنوی تہذیب اور معاشرے کی پوری تصویر موجود ہے۔ شرر مسلم معاشرے کو اس کی تاریخ اہمیت اور اس کے تہذیبی بکھراؤ کا ماضی کی عظمتوں سے احساس دلا کر اسے تقویت دینا چاہتے ہیں۔ نیز عیسائی معاشرے کا اسلامی معاشرے سے مقابلہ کر کے مسلمانوں کی نظر میں عظمت رفتہ کی فوقیت ثابت کرتے ہیں۔ شرر کا انداز جذبہ تفاخر لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تہذیب صرف ماضی کی تاریخ یاد دہانیوں سے ہی درستی کی جانب گامزن ہو سکتی ہیں۔ رسوا کے ہاں ناول کا ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ روزمرہ زندگی سے پلاٹ اخذ کے کر معمولی شخصیتوں میں بھی عظمت اور دلاویزی کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے ناول میں تہذیبی رجحان کی عکاس ملتی ہے۔

اردو ناول کا دور جدید بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں میدان عمل ، گئودان اور بازار حسن وغیرہ مشہور ہیں۔ انھوں نے بر صغیر کے دیہات متوسط و محنت کش طبقوں کی

زندگی کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری فنی و فکری اعتبار سے گزشتہ ادیبوں کے ناولوں سے چند قدم آگے محسوس ہوتی ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت مقامی رنگ اور فطرت انسانی کا باریک بینی سے مشاہدہ ہے۔ پریم چند کے زیر اثر اور ۱۹۳۶ میں ترقی پسند تحریک کے آغاز پر بہت سے اچھے ناول لکھے گئے۔ جن میں سے سجاد ظہیر کا لندن کی ایک رات، کرشن چندر کا شکست اور عصمت چغتائی کا ٹیڑھی لکیر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ کے عہد کا دور ناول کی مقبولیت کا دور ہے۔ رئیس احمد جعفری، رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، ایم۔ اسلم، نسیم حجازی اور رقیبی رام پوری کے ناول بہت مشہور ہوئے۔ قراۃ العین حیدر کا آگ کا دریا، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی اور ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی فنی لحاظ سے اہم ناول ہیں۔ ان کے علاوہ عبداللہ حسین کا اداس نسلیں، جمیلہ ہاشمی کا تلاش بہاراں، خدیجہ مستور کا آنگن، فضل احمد کریم کا فضلی کا خون جگر ہونے تک، انتظار حسین کا بستی اور بانو قدسیہ کا راجہ گدھ اہم ہیں۔ یہ دور برصغیر کی ادبی و فکری تاریخ کے لیے غیر معمولی دور تھا۔ یورپ سے آنے والی نئی تہذیب، نئی تعلیم کی اہمیت، پرانی تعلیم کی فرسودگی، عیسائی مذہب سے مناظرے وغیرہ ایک ٹکراؤ کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ جس میں مٹی ہوئی پرانی روایت کے ساتھ تہذیبی بقا کی کوشش نظر آتی ہے۔ اردو ناول اپنے مزاج کے اعتبار سے زندگی اور انسانوں کے مسائل سے قریب ہو گیا۔ اس میں بہت حصہ ترقی پسند کا بھی ہے جس کے تحت ناول کا اسلوب کہانی کے نئے طرز بیان، نفسیاتی اور سماجی الجھنوں، وقت، انسانی زندگی اور اس کے عمل دخل کا نئے ڈھنگ کے ساتھ احاطہ کرتا ہے۔ ناول میں اصلاح، مذاق اور مثالیت پسندی سے نکل کر عملی اور حقیقی زندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جس کی جھلک ہمیں پریم چند کے ہاں نظر آتی ہے۔ عصمت چغتائی، کرشن چندر اور عزیز احمد اس دور کے نمائندہ ادیب ہیں۔

بیسویں صدی میں پریم چند کے افسانوں میں دیہات میں رہنے والے لوگوں کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ اور اردو افسانے کو حقیقت نگاری کے فن سے آشنا کرایا۔ اسی دور میں سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں کے ذریعے رومانوی افسانہ نگاری کی بنیاد رکھی۔ پریم چند سے متاثر ہو کر لکھنے والوں میں راشد الخیری اور علی عباس حسینی اہم ہیں۔

۱۹۴۷ء تک کے افسانے کے فن کو فروغ دینے والوں میں علی عباس حسنی، کوثر چاند پوری، اعظم کریوی، راجندر سنگھ بیری، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، بلونت سنگھ، غلام عباس، انتظار حسین، شوکت صدیقی، محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی اور خواجہ احمد عباس کے نام اہم ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ادبی صورتحال:

پاکستان حاصل کرنے کی بہت کوششیں کی گئیں، آزادی کی کسے خواہش نہیں ہوتی۔ ہر غلام فرد انسان آزاد ہونا چاہتا ہے اور اس کے لیے بے پناہ کوششیں کرتا ہے۔ آزاد وہ شخص اور وہ قوم ہے۔ جس پر اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ اس آزادی کے لیے وہ جان و مال کا نزرانہ پیش کرتے ہیں۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک بھی یہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمان، ہندوؤں کا اکٹھا رہنا بہت مشکل تھا۔ پاکستان کے قیام کے وقت ہندو مسلم اور سکھ فسادات عروج پر تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے جان کے دشمن تھے۔ اس معاشرتی صورتحال کی عکاسی بالخصوص رشتوں کے ٹوٹنے اور ایک نئے خود غرض سماج کے ظہور میں آنے کی داستان سے اردو ادب کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ لیکن اس کی عکاسی فوراً نہیں ملتی۔

تقسیم سے پہلے کی ادیب کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی، ڈاکٹر احسن فاروقی لکھ رہے تھے۔ بعد میں اس قافلے میں دیگر قابل ذکر مصنفین قراۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، نثار عزیز بت، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، عبداللہ حسین، غلام الثقلین نقوی، انتظار حسین، جوگندر پال، عبدالصمد، حیات اللہ انصاری اور مستنصر حسین تارڈ شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد افسانوں ادب میں اہم اضافے کرنے والوں میں غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد اے۔ حمید، الطاف فاطمہ، غلام الثقلین نقوی، انتظار حسین اور انور سجاد کے نام اہم ہیں۔ خالدہ اصغر، منشاد، یونس جاوید، مسعود اشعر اور بہت سے دوسرے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں بدلتی ہوئی قوم پرستی اور رومانیت کے زیر اثر لکھنا شروع کیا۔ لیکن حقیقت نگاری ناانصافیوں اور تضادات کے اظہار کو اپنے فن کا موقع بنایا۔ ان کے ناولوں میں میدان عمل اور شنگو دان اور افسانوں کے مجموعوں میں زاددر دااور وار ادت اہم ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک میں توازن پیدا ہوا اور بہت سے نئے لکھنے والے بھی میدان میں آئے۔ جن میں نثر نگاروں میں قراۃ العین حیدر، غلام عباس، انتظار حسین، حسن عسکری، مولانا اصلاح الدین احمد، میرزا ادیب، امتیاز علی تاج اور شاعروں میں ن۔ م۔ راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، مجید امجد، ناصر کاظمی اور ابن انشا کے نام اہم ہیں۔ اس دور میں قوم پرستی اور جدیدیت کا رجحان غالب رہا۔ اور ادیب بدلتے ہوئے حالات میں اپنے فن کی بنیادوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

۱۹۸۰ء کے آغاز اور بعد کا ناول ہیئت، اسالیب اور رحجانات کے اعتبار سے پاکستان میں ناول کے نئے ذائقوں سے روشناس کراتا ہے۔ انتظار حسین کے ناول بستی کا ماضی کی یادوں یا ناسٹلیجیا کے حوالے سے بہت چرچا تھا۔ اس دہائی میں ناول کی تخلیق کی رفتار میں خاصی تیزی آئی۔ حجاب امتیاز علی نے پراسرار رومانی فضا کو پیش کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا

ناول پاگل خانہ منظر عام پر آیا۔ فہیم اعظمی کا جنم کنڈلی، طارق محمود کا اللہ میگھ دے، رضیہ فصیح احمد کا صدیوں کا زنجیر اور سلمی اعوان کا تنہا منظر عام پر آئے۔ مجموعی طور پر ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک پاکستان کے ناولوں میں موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ناول کی تخلیقی رفتار تو وہی ہے۔ لیکن اس کا اتنا چرچا نہیں ہوا۔ تاہم اس دور میں چند اہم ناول جو منظر عام پر آئے۔ ان میں مستنصر حسین تارڑ کے دو ناول بہاؤ اور راکھ، انیس ناگی کا ناول محاصرہ امراؤ طارق کا ناول معتوب اہم ہیں۔

پاکستان میں اردو غزل کی مقبولیت کا نیا دور شروع ہوا۔ اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے حسرت موہانی، اصغر گوندوی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھ پوری اردو غزل کا وقار بحال کر چکے تھے۔ لیکن غزل کے لیے فضا زیادہ سازگار نہیں تھی۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں غزل کو فروغ حاصل ہوا۔ ناصر کاظمی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، احمد فراز، اور پروین شاکر نے غزل کے حسن میں اضافہ کیا۔ نظم پابندی سے آزاد ہوئی اور ادب نثری نظم تک پہنچ گئی ہے۔ پاکستان میں نظم کے شعراء میں احسان دانش، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی ان میں قابل ذکر ہیں۔

ہر دور کے پاکستانی ادب میں اس دور کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے۔ پاکستان اہل قلم کی اکثریت تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کا شکار تھی یا شاہد اس لیے ایک عرصے تک یہ فسادات ہمارے ادب کا موضوع بنتے رہے۔ اس کے ساتھ اس نئی مملکت کی تعمیر کے خطوط واضح کرنے کے لیے تاریخی ناول نگاروں نے اسلام کے مختلف ادوار کے نقشے اور موقع پیش کئے۔ ہجرت کی وجہ سے ہمارے ادیبوں کے ہاں ہجرت کے موضوع نظر آتے ہیں۔ ہمارے ادیب یاد ماضی میں بھی کھوئے رہے۔ پھر وہ اپنے تشخص کی تلاش میں نکلے۔ اور پاکستانی ثقافت ایک دور میں موضوع بحث بنی رہی۔ شوکت صدیقی کا ناول جانگلوس، پاکستانی کینوس میں لکھا گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستانی ادب میں ایک اہم موڑ آیا۔ امجد اسلام امجد کا ڈراما وارث اس سلسلے میں بے حد اہم ہے۔ وطن کے گیت لکھنے کی ابتدا ہوئی اور اب یہ ایک مستقل موضوع بن گیا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی کئی ناول لکھے گے۔ الغرض مجموعی طور پر قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو ادب کے مختلف رجحانات:

رجحان کا مطلب فیشن، جھکاؤ، میلان یا کوئی خاص رخ ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لئے ٹرینڈ کی اصلاح استعمال کی گئی ہے۔ پہلے ایک تحریک شروع ہوتی ہے۔ جو بعد میں رجحان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ادبی تحریک میں

سیاسیات یا معاشیات کی طرح کسی ٹھوس شے کا حصول مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی اساس ذہنی ہوتی ہے۔ اس لیے ادب میں تحریک بالکل ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک رجحان کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رجحان سے تحریک بنتی ہے۔ اور پھر رجحان پر ہی ختم ہوتی ہے۔ رجحان کی تعریف ڈاکٹر ممتاز احمد خان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ادب میں رجحان ایک ایسے رخ یا میدان کی جانب اشارہ ہے۔ جو کسی خاص قسم کے موضوع سے تعلق رکھتا ہو۔ یعنی یہ ایک خاص ذہنی رویہ ہے۔[۲۸]

ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہے۔ اس لیے جیسے جیسے حالات بدلتے جاتے ہیں۔ ویسے ویسے نئے خیالات اور نظریات انسانی ذہن میں پرورش پاتے ہیں۔ بدلتے حالت میں جو نیا خاص رویہ پروان چڑھتا ہے۔ اسی کے تحت سب ادیب لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی رویے پر ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد لکھنے لگتی ہے۔ جیسے آزادی سے ادب کا مقصد اصلاح تھا۔ چنانچہ اصلاحی ناول لکھے گئے۔ ادب کا مقصد جدیدیت، ترقی پسند رومانوی تھا۔ تو اسی تحت ادب لکھا جانے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد وقت اور حالات نے بلنا کھایا تو حقیقت پسندی نے جگہ لے لی۔ اس کو خاص رویہ یا رجحان کہتے ہیں۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی رجحان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> ادب میں نئے رجحانات بدلتے ہوئے حالات اور ان کے نتیجے میں نئے نئے خیالات اور نظریات کے زیر اثر پیدا ہوتے ہیں۔ جب معیاروں میں تبدیلی ہوتی، اقدار نئی صورتیں اختیار کرتے ہں۔ تو ادب بھی ان سے متاثر ہوتا ہے۔[۲۹]

تحریک اور رجحان۔ عمومی تعریف:

تحریک، رجحان اور رویہ ایک ہی تسلسل کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جمود کو توڑنے، ٹھہراؤ کو ختم کرنے ایک حالت سے دوسری حالت میں ڈھل جانے کی کوشش اگر فرد واحد میں پیدا ہو تو رویہ کہلائے گی۔ کئی ایک افراد میں جنم لے تو رجحان اور اگر پھیل کر لپٹ سے افراد، گروہ، قبیلے یا معاشرے کو اپنے دائرے میں کھینچ لے تو اسے تحریک کہا جائے گا۔

تحریکیات، رجحانات اور رویے زندگی کا لازم ہیں۔ ان سے جہاں ایک طرف زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے۔ جمود ٹوٹتا ہے اور یک رنگی فضا ختم ہوتی ہے۔ وہاں نئے رنگوں کی نمود ہوتی ہے۔ نئی معنویت اور نئی صداقتیں فروغ پائی ہیں اور نئے نظریات وافکار کا راستہ کھل جاتا ہے۔ شخصی رویے تو اپنی محدودیت کی بنا کچھ زیادہ اثر اندازی نہیں دکھا پائے لیکن رجحانات اور تحریکوں کے اثرات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ رجحان جس شعبے سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی میں اثر دکھانا ہے۔ مذہبی رجحانات صرف ادب تک ہی محدود رہتے ہیں۔ جبکہ تحریک کسی ایک شعبہ زندگی سے متعلق ہو کر بھی

محض اسی تک محدود نہیں رہتی بلکہ دیگر شعبہ ہائے زندگی کو بھی متاثر کرتی ہے۔

نئے ادبی رجحانات اور روایات کا تسلسل:

بیسویں صدی کے طلوع کے ساتھ ہی اردو کے ادبی افق پر نئے رویوں اور رجحانات کی جھلمل شروع ہو گئی۔ رومانیت اور حقیقت کے دو متضاد اور مختلف الطرفین رجحان ایک ساتھ ابھرے اس کے بعد احیائے مذہب اور قومیت و ملت، روایتی اخلاقی اقدار کے خلاف نفسی، جنسی، باغیانہ پن، معاشی تصورات پر مبنی ترقی و انقلاب، اسلامی و غیر اسلامی کا تصادم، ارضی و سماوی تعلق، خوف و جبر اور مغائرت کا احساس، علامات، تجرید اور تمثیل کا جوش اور ہونے نہ ہونے کے دائروں میں مختلف اور متنوع رجحانات بتدریج نمایاں ہوتے چلے گئے۔ ان میں سے کئی رجحانات نے وسعت کی بنا پر تحریکوں کی شکل اختیار کر لی۔ جن کے زیر اثر جہاں بہت سے رویوں کا آغاز ہوا۔ وہاں رد عمل کے طور پر کئی نئے رویے بھی ابھرے۔ اس صدی کے تقریباً ہر رجحان کے فوری محرکات میں مغربی اثرات او نیا منظر نامہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن صدیوں پر پھیلے ادبی تسلسل سے قطع نظر محض مغرب مغرب کے نئے منظر نامے کو ان رجحانات کے فروغ کا سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نئے ادب کو روایت کے تسلسل میں دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں رومانیت، حقیقت، مذہب، جنس اور معاش کے جن رجحانات کو فروغ ملا۔ ان کی مختلف شکلیں اردو ادب میں پہلے بھی اظہار پاتی رہتی تھیں۔ داستانوں قصوں میں عجیب و غریب دنیائیں، خیر و شر کی آویزش، مثالی کرداروں ماحول، عورت و مرد کی جسمانی کشش، حسینی آسودگی اور لذت خیزی، ظلم و جبر کے خلاف بڑائیاں، تلاش و جستجو کے لامثالی سلسلے فرد کی تنہائی، اور بے بسی، محنت کی کرشمہ سازیاں، سرمائے کی ریل پیل و کمی کے اثرات اور نادیدہ ذہنی و روحانی قوتیں ایسے عناصر ہیں۔ جن کی بار بار تکرار ملتی ہے۔

اردو شاعری کا بیشتر حصہ رومانی جذبوں، عشق و محبت کے ہیجان انگیز نغموں، اور تصوراتی و تخیلاتی جمال پرور فضائوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جنسی لذئیت پرستی اور آسودگی و ناآسودگی کے مسائل سے لکھنوی شاعری بھری پڑی ہے۔ مذہب و اخلاق، اور انسانی و روحانی قدروں کا درس روز اول ہی سے اردو شاعری کا جزو قرار پاتا ہے۔ معاشرے و ثقافت، ارضی و سماوی رشتے اور خدا، انسان اور کائنات کے باہمی ربط و ضبط پر غور فکر کی روایت بھی قدیم سے موجود ہے۔ چنانچہ انیسوی صدی کا سارا ادب انھی روایات کی توسیع شکل ہے۔ بیسویں صدی کے ادیبوں نے روایت کے اس تسلسل کو قائم رکھا۔ اور اس میں نئے معانی بھی پیدا کئے۔ اردو ادب میں مختلف رجحان پروان چڑھے ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ رومانی رجحان:

رومانیت کا رجحان اردو ادب میں بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں سامنے آیا۔ اس سے قبل اردو شعر و نثر میں رومانی رویے ملتے ہیں۔ لیکن کلاسیکیت کی مظبوط گرفت کی بدولت یہ رجحان کی شکل اختیار نہ کر سکے۔ اس کلاسیکی گرفت کو ۱۸۵۷ء کے بعد علی گڑھ تحریک نے توڑا۔ تاہم ضابطوں کی حدود و قیود بدستور رہیں۔ رومانیت کلاسکیت کے خلاف رد عمل کا نام ہے۔ ضابطوں، پابندیوں اور قواعد و قوانین کی جکڑ بندیوں کے خلاف بغاوت۔ اعتقادات۔ روایات اور معیارات کی مروج قیود سے آزادی اور انفرادیت، تخیل اور جذبات کی طرف سے رومانیت کے بنیادی خصائص ہیں۔

رومانیت کے اجزائے ترکیبی میں اگرچہ احتجاج، فرار، بغاوت، انائیت اور انفرادیت جیسے عناصر موجود ہیں۔ لیکن تاریخی طور پر رومانیت ایک مفید داخلی قوت کی حیثیت سے اپنی پہچان کرواتی ہے۔ اپنی تمام تر نگارنگی اور تنوع کے باوجود رومانیت کا مرکزی دھارا تبدیلی اور انقلاب کے مثبت مفاہم سے ہی عبارت ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی رومانیت خوش آئند امکانات اور سکون آور عجائب و غرائب کا عکس دکھاتی ہے ممکنات کے نئے زاویوں سے پردہ اٹھاتی ہے اور تقلید کے بجائے آزادی اور کشادہ روی سے نئی دنیاؤں کی طرف سفر کے لیے رغبت دلاتی ہے۔ یعنی رومانیت محض ایک ذہنی کیفیت نہیں بلکہ ایک پورے نظام فکر کی حیثیت رکھتا ہے

رومانوی نثر نگاروں میں سب سے بڑا نام سجاد حیدر ریلدرم کا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ خیالستان اور دوسرا حکایات و احساسات کے نام سے ۱۹۲۶ء۔۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ ان افسانوں میں ریلدرم نے جن رومانی رویوں کو پیش کیا۔ ان کی نہ صرف ان کے معاصرین بلکہ بعد میں آنے والوں نے بھی تقلید کی۔

> پیارے دوست! تمہیں یاد ہے کہ نہیں، بہار کا موسم تھا۔ شام کا وقت تھا وادی میں دریا کی موجیں ساحل کی گردن چومتی تھیں اور ہلکی ہلکی لوریاں گاتی تھیں۔۔۔۔۔ افق میں آفتاب کی پژمردہ شعائیں بادلوں میں رنگ برنگ کا ہالہ بنا کے نکل رہی تھیں۔ فضائے وادی میں نہ ہوا تھی۔ نہ حرکت، صرف دریا کے نیلگوں پانی پر آفتاب کی شعاعوں کے مقابل، ایک کشتی جو گویا ایک بے ہوشی کے عالم میں جاری تھی۔[۳۰]

نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، حجاب امتیاز علی، لطیف احمد، محمد علی، مسز عبدالقادر، مجنوں گورکھ پوری، خلیق سجاد، عبدالرحمن مجنوری، چوہدری افضل حق، مہدی افادی اور قاضی عبدالغفار کا نام قابل ذکر ہے۔

۲۔ حقیقت پسندانہ رجحان:

بیسیوں صدی کے اوائل کا منظر نامہ رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کے رجحان کا باعث بھی بنا۔ لگے

بندھے معیاروں سے نکل کر آزادی اور کشادہ روی سے سوچنے کے عمل نے اس وقت کے ذہن کو مختلف سطحوں پر متنوع زاویوں کے ساتھ سامنے آئی۔ اردو ادب میں حقیقت نگاری کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ داستانوں میں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی اس سلسلے میں اولین مثال ہیں اردو شاعری میں مبالغہ آمیز عناصر کے باوجود ایک بڑا حصہ حقیقت نگاری کے معیاروں کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔ دبستان دکن اور دلی لکھنو میں شاعروں نے جہاں داخلی حقیقت نگاری پر توجہ مرکوز رکھی وہاں خارجی حقائق کے بھی عمدہ مرقع پیش کیے۔

حقیقت نگاری کا کڑا معیار فوٹو گرافی کے مترادف ہے۔ حقیقت نگار فوٹو گرافر کی طرح اپنی مرضی اور ذاتی پسند و ناپسند سے قطع نظر منظر کو فوکس کرتا ہے۔ موجودہ صورتحال میں جو چیز جس انداز اور جس ترتیب میں ہے۔ اسی انداز اور ترتیب سے پیش کر دیتا ہے اسے اضافے اور کانٹ چھانٹ کا اختیار نہیں دوسرے لفظوں میں زندگی کی سچی اور طمع کاری سے پاک تصویر کشی، جس میں ذاتی تاثر اور تخیل کو دخل نہ ہو۔ حقیقت نگاری ہے۔ عزیز احمد اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> حقیقت نگار کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی نقاشی کرے۔ وہ کچھ پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا، کچھ نہیں چھپاتا۔ نظریاتی طور پر وہ انتخاب یا تراش خراش کے اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ غیر متعلق تفصیلات کو البتہ وہ کم کر سکتا ہے۔ اس کا انداز بیان بہت صاف اور سیدھا ہوتا ہے۔ اس کا اسلوب اس کے موضوع سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی رائے کا بہت کم اظہار کرتا ہے۔ روایت کا وہ پابند نہیں۔ واقعی زندگی سے وہ جتنا قریب ہو سکے وہ اتنا ہی بڑا حقیقت نگار ہو گا۔[۳۱]

پریم چند سب سے بڑے حقیقت نگار ہیں۔ پریم چند کے ہاں حقیقت نگاری کا اولین زاویہ حب وطن، قومی یکجہتی اور قومی آزادی کے موجود عصری جزبوں کی نقش گری کی صورت میں سامنے آیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ سوز وطن کی محبت قومی غیرت و محبت اور غیر ملکی تسلط کے خلاف اشتعال انگریز رویوں کا بھرپور عکس کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ افسانے اپنے زمانے کی سچی تصویریں ہیں۔

> تو کچھ معلوم بھی تو ہو کہ دنیا مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ مجھ میں عقل ہے، جان ہے، ہونس ہے، جانور کیسے بن جاؤں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اپنے کو ابگا گئی سمجھوں اور ایک ٹکڑا روٹی کھا کر پڑی رہوں۔ ایسا کیوں کروں؟ سنسار مجھے جو چاہے سمجھے میں اپنے آپ کو بھاگئی نہیں سمجھتی میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔ میں اسے اپنی ذلت سمجھتی ہوں۔ کہ قدم قدم پر مجھ پر شک کیا جائے۔ ہمیشہ چرواہوں کی طرح کوئی لاٹھی لیے میرے پیچھے گومتا رہے کہ کسی کے کھیت میں نہ جا پڑوں یہ حالت میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔[۳۲]

ڈاکٹر احسن فاروقی اور عبد اللہ حسین نے تاریخ کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور اس طرح سے انھوں نے تاریخ اور تہذیب دونوں کو ملا دیا ہے۔ ان کے ناولوں میں شام اودھ ، آبلہ دل کا ، رخصت اے زنداں اور سنگم وغیرہ شامل ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناولوں قید، بھاگ میں معاشرے اور جنگ کے ظالم وستم کا بیان ہے۔

نادار لوگ ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۸ء تک کے دور پر محیط ہے اس میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ تاریخ اور کردار کو آمنے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان حالات نے لوگوں کو کس طرح متاثر کیا۔

حقیقت پسندانہ رجحان کے حامل نمائندہ ناولوں میں فضل کریم فضلی کا ناول خون جگر ہونے تک ،سید شبیر حسین کا ناول جھونک ،سیال شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی اور جانگلوس، عبداللہ حسین کا ناول باگھ وغیرہ شامل ہیں

۳۔ تہذیبی رجحان:

برصغیر میں ایک وقت ایسا تھا، جب اخلاقی اقدار کی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ سب آپس میں پیار و محبت سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ رواداری اور مہمان نوازی عام تھی۔ اس کے بعد معاشرے کے اونچے طبقے میں اخلاقی اقدار کا زوال آیا۔ منافقت اور ریاکاری نے اپنی جگہ بنائی اور ناول نگاروں ادیبوں شاعروں نے اس رجحان کو تحریروں میں موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ایک نام عزیز احمد کا ہے۔

تہذیبی رجحان رکھنے والے نمائندہ ناولوں میں قراۃ العین حیدر کا گردش رنگ چمن ، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی، جیلانی بانو کا دیوان غزل ،ڈاکٹر احسن فاروقی کا شام اودھ اور مستنصر حسین تارڑ کا بہاؤ شامل ہیں

۴۔ علامتی اور استعاراتی رجحان:

پہلے ناولوں شاعری میں منطقی تسلسل ہوا کرتا تھا۔ لیکن علامتی استعاراتی رجحان نے اس ہیئت کو توڑ ڈالا۔ اس کے علاوہ ناولوں میں کرداروں کے حوالے سے بھی ہیرو اور ہیروئن کا جو نظریہ ہے وہ بھی ان ناول نگاروں کے ہاں ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے ان لوگوں نے شعور کی رو کی تکنیک کو کام میں لاتے ہوئے ایک صحیح صنف پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کی وجہ سے ان کے ناولوں میں لایعنی تصورات نے جگہ پائی۔ علامتی اور استعاراتی رجحان انتظار حسین کے ہاں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو دیکھا۔ ہجرت کے بعد اس نے وہی تہذیب دیکھنے کو

کوشش کی تو اسے مایوسی ہوتی اس لیے انھوں نے اساطیری علامتوں اور دیومالائوں کے زریعے ذہنی طور پر ماضی کی طرف سفر کیا اس سلسلے میں ان کا اہم ناول بستی ہے۔

انور سجاد کا مختصر ناول خوشی کا باغ علامتی اور استعاراتی ہونے کی وجہ سے بڑا پیچیدہ ہے۔ان کا ناول جنم روح میں خوف، گھٹن، مایوسی اور بہت سے علامتی اور استعاراتی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔انیس ناگی کے ناول دیوار کے پیچھے میں لاتعداد استعارے علامتیں اور خود کلامی کی کیفیت نظر آتی ہے۔

۵۔ جنسی اور نفسیاتی رجحان:

مخالف جنس یا صنف یا جنسی کشش کی ایک مستقل صورت ہے۔ یہ رجحان مخالف جنس پرستی ہم جنس پرستی اور دو حیثیت پرستی کے تحت جانے جاتے ہیں نفسیات اور ادب کا گہرا تعلق ہے جنسی اور نفسیاتی رجحان کے تحت بہت سا ادب لکھا گیا اس رجحان کے لکھنے والوں نے جنسی اور نفسیاتی مسائل اور تجربات کو اپنی تحریروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی قسم کے تلزذ کا شکار نہیں ہوئے کیونکہ ان کے سامنے انسانی نفسیات کا بیان کرنا تھا انھوں نے اگر جنس کے موضوعات کو بیان کیا بھی تو صحت منہ حوالے سے جنسی رجحان کے سلسلے میں عصمت چغتائی منٹو کا نام قابل ذکر ہے۔ عصمت چغتائی کے ناول سیڑھی لکیر میں جنسی رجحان اور ضدی میں جنسی و نفسیاتی رجحان موجود ہے۔ عزیز احمد کے ناول شبنم ،گریز اور ایسی بلندی ایسی پستی، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی" شموئل احمد کا ندی ،اکرام اللہ کا ترک شب اور بانو قدسیہ کا راجہ گدھ اہم ہے۔

منٹو کے نزدیک جنسی اور نفسیاتی امور کی کچھ حقیقتیں ہیں ان کے افسانے کالی شلوار، ہتک ، ممی، پڑھے کلمے جنسی شدت کا شکار ہیں اور بابو گوپی ناتھ اور میرا انام رادھا نفسیات کے حوالے سے اہم افسانے ہیں۔ صدیق سالک کا ناول پریشر ککر کے کردار کا مکمل نفسیاتی تجزیہ موجود ہے۔ الطاف فاطمہ کے ناول نشان محفل ، دستک نہ دو اور چلتا مسافر میں نفسیاتی رجحان نظر آتا ہے۔

۶۔ پاکستانی معاشرے کی عکاسی کا رجحان:

بہت سے ادیبوں کی تحریروں میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کا رجحان نظر آتا ہے۔ ہر انسان اپنے ارد گرد سے متاثر ہوتا اور اپنی تحریروں میں اس کو بیان کرتا ہے۔ دراصل ۱۹۸۴ء کے بعد جو معاشرہ بنا، وہ امیدیں پیدا کرنے والا معاشرہ نہیں تھا۔ ادیبوں نے ہو بہو معاشرے کی عکاسی اپنی تحریروں میں کی ہے جرائم پیشہ معاشرے کے حوالے سے عبداللہ حسین اہم ناول نگار ہیں۔ان کے ناولوں میں قید، بھاگ میں معاشرے اور جنگ کے ظلم و ستم کو بیان کیا

ہے۔نادار لوگ میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ تاریخ اور کردار کو آمنے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں اور پھر یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان حالات نے لوگوں کو کس طرح متاثر کیا۔

شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی اور جانگلوس میں پاکستانی اور دیہاتی معاشرے میں جاگیر دارانہ نظام اور ظلم و جبر کو بیان کیا ہے۔

۷۔سیاسی رجحان:

سیاست انسانی زندگی کا اہم جزو ہے اور ادب میں ہمیشہ سیاست کا رنگ نظر آتا ہے۔ اردو فکشن میں اس کا اظہار خاص طور پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا، جب جان و مال کی بڑی تباہی دیکھنے میں آئی۔ برصغیر میں آزادی کی تڑپ نے سیاسی صورت حال پیدا کی جس کو ادیبوں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ حیات اللہ انصاری کا ناول لہو کے پھول رشیدہ رضویہ کے ناول لڑکی ایک دل کے ویرانے میں، اسی شمع کے آخری پروانے میں اور گھر میرا راستے غم کے، عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں اور باگھ، خدیجہ مستور کا زمین، الطاف فاطمہ کا چلتا ہوا مسافر، سلمیٰ اعوان کا ناول تنہا، جیلانی بانو کا ناول بارشِ سنگ، فضل بہاؤ، رضیہ فصیح احمد کا ناول صدیوں کی زنجیر اور طارق محمود کا ناول اللہ میگھ دے وغیرہ اہم ہیں۔

۸۔ناسٹلجیائی رجحان:

ناسٹلجیا یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گھر جانے کی دردناک خواہش۔ ماضی میں کچھ سپاہی ایسے تھے جو اپنے گھر جانا چاہتے تھے لیکن جا نہیں سکتے تھے تو ان کے اندر ایک نفسیاتی مرض پیدا ہوا جسے ناسٹلجیا کہتے ہیں۔ وہ فوجی دل شکستگی اور اداسی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اسے ہم ماضی کے شدید احساس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسے عام طور پر ماضی کی خوشگوار یادوں کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر انسان اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے اور اس میں جانا پسند کرتا ہے۔ اس لیے تمام ادیبوں کی تحریروں میں ناسٹلجیا کا در آنا فطری امر ہے۔

ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے جانے والے نمائندہ ناول نگاروں میں تارڑ کا ناول بہاؤ، بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی، خدیجہ مستور کا آنگن اور زمین، الطاف فاطمہ کا نشانِ محفل، انیس ناگی کا دیوار کے پیچھے، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اہم ہیں۔

ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھے جانے والے نمائندہ افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، قراۃ العین حیدر، رشید امجد، امراؤ طارق رام، مظہر الاسلام اور مسعود مفتی اہم ہیں۔ مزاح نگاری میں بھی ناسٹلجیائی رجحان کے تحت لکھنے میں

مشتاق احمد یوسفی کا ناول آبِ گم قابل ذکر ہے۔ ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، فیض احمد فیض، مجید امجد، ن۔م راشد، ٹی۔ایس۔ایلیٹ کی شاعری میں ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔

ان رجحانوں کے علاوہ اردو ادب میں اور بھی بہت سے رجحان موجود ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

آدرشی رجحان: جس کے تحت الطاف فاطمہ کا دستک نہ دو اور نثار عزیز بٹ کا نگری نگری پھرا مسافر اہم ہیں۔

فکاہیہ رجحان: اس کے حوالے سے ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی اور الکھ نگری اہم ہیں۔

دستاویزی رجحان: اس کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں جمیلہ ہاشمی کا دشتِ سوس، احسن فاروقی کا سنگم اور شمس الرحمٰن فارقی کا کئی چاند تھے سرِ آسماں اہم ہیں۔

خود سوانحی رجحان: اس کے تحت لکھے گئے ناولوں میں قراۃ العین حیدر کا تین جلدوں پر مشتمل ناول کارِ جہاں دراز ہے، اہم ہیں۔

رومانی اور عشقیہ رجحان: اس میں اے۔آر خاتون، رضیہ بٹ اور بشریٰ رحمٰن کے تقریباً تمام ناول شامل ہیں۔

تجریدی رجحان: اس کے تحت انتظار حسین اور ڈاکٹر انور سجاد کا نام اہم ہے۔

محبت کے رجحان: اس میں اشفاق احمد کا بڑا نام ہے۔

تاریخ کا رجحان: یہ رجحان زیادہ تر زاہدہ حنا کے ہاں نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادب آج کے دور تک آتے آتے اپنے اندر عہد کی پوری داستان سموئے ہوئے ہیں۔ اس میں ہمیں ہر قسم کے موضوعات اور رجحانات ملتے ہیں۔

ادب میں ناسٹلجیائی رجحان کی ابتدا:

قراۃ العین حیدر کے بقول اردو کا سارا ادب ناسٹلجیا کی پیداوار ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد پرانی یادیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانی رویوں کے پیچھے ماضی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ماضی جو تحت الشعور میں جذب ہوتا ہے۔ ماضی کے تجربے، مشاہدے جس حال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نوسٹلجیا میں مبتلا انسان ان کیفیات میں سے زیادہ گزرتا ہے۔ انسانی دماغ محض طبعی طور پر چلنے والا میکینزم نہیں ہے۔ یہ ایک معجزاتی تخلیق ہے جس میں کل کائنات سمائی ہوئی ہے جس میں پورا ماضی جمع ہے۔ ہر خوشی، ہر دکھ اور حادثہ دماغ میں سانسیں لے رہا ہے۔ یہ حال میں کس طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی کو کیسے متاثر کرتا ہے یا رویوں کا کس طرح تعین کرتا ہے۔ اس امر سے ہر کوئی واقف نہیں ہوتا۔

ناسٹلجیا سے مراد یادِ ماضی یعنی پرانی روایات سے وابستہ رہنا۔ ماضی کی داستانوں، قصے خیالوں میں کھوئے رہنا

اور انھی پر نوحہ خوانی کرتے رہنا۔ گزرے ہوئے لمحات و واقعات کی یاد دل میں بسائے رکھنا اور زندگی کے ہر پہلو میں اسی کے بیان کرنے کا نام ہے۔

تقسیم کے وقت ہونے والے فسادات اور آبادی کی جبری منتقلی وہ سانحے تھے جنھوں نے براہِ راست فرد کی ذات کو متاثر کیا۔ انسان کو ایک نئی زمین اور غیر مانوس تہذیب میں دھکیل دیا۔ تقل مکانی تاریخ کے ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ انسان ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتا رہا ہے۔ نقل مکانی انسانی فطرت میں شامل ہے مگر تقسیمِ ہند سے پہلے کبھی بھی آبادی کے اتنے بڑے حصے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا گیا لیکن تقسیمِ ہند میں یہ سب ہوا۔ یہ سانحہ اتنا بڑا تھا کہ لوگوں کے حواس برقرار نہ رہے۔ جب انھیں حالات کا شعور حاصل ہوا تو دنیا بدل چکی تھی۔ چنانچہ ہجرت کرنے والوں کے یہاں ناسٹلجیا پوری شدت سے ابھرا۔

زمین سے بے دخلی کا احساس فرد کی شخصیت کو منہدم کر دیتا ہے کیونکہ بے دخلی محض زمین سے رشتے کا انقطاع نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب اپنے ماحول، اپنی اقدار اور اپنی روایات سے کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ادب نے اس احساس کو جو اپنی تہذیب اور اپنی زمین سے کٹ جانے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے، اپنا موضوع بنایا۔ وہ ماضی جو وہ کھو چکے تھے۔ اس کی کھوج کو ادب کا موضوع بنایا۔

ادب میں تحریکِ آزادی کے حوالے سے نویں دہائی تک آتے آتے ہم ایک نئے ذائقے سے روشناس ہوتے ہیں جس کی دوسری شکل کو ایک فکری جہت بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جہت ناسٹلجیا سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں مسئلہ اس غارت گری کا نہیں ہے جو تحریکِ آزادی کے بعد ان لوگوں کا ذہنی سرمایہ ہے۔ جو لوگ اپنا گھر بار اور اپنا مخصوص کلچر وہاں چھوڑ آئے تھے۔ ایک جمے جمائے ماحول سے اچانک اٹھ کر دوسرے ماحول میں آجانا گو کہ وہ رضاکارانہ فعل ہو نا ناسٹلجیا یا غریب الوطنی کے احساس سے اجتناب نہیں کرنے دیتا کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے۔ ناسٹلجیا پہلے دن سے انسانی فطرت میں موجود ہے کیونکہ سرکارِ دوعالم ﷺ مدینہ میں مکہ کو یاد کرتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ اسی طرح ہمیں ادب میں مختلف ادیبوں کے ہاں ملتا ہے۔ اس اعتبار سے خاص طور پر انتظار حسین اور قراۃ العین حیدر کا نام لیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے روبینہ الماس کا کہنا ہے:

> ماضی کی بازآفرینی کا شدت سے استعمال قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے یہاں ملتا ہے بلکہ افسانوں میں ماضی کی بازآفرینی کی روایت کے موجد قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین ہیں۔ [۳۳]

قراۃ العین حیدر کی ناول نگاری کا آغاز میرے بھی صنم خانے سے ہوتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اودھ کے تعلق داروں کی زندگی، ذہنیت اور نفسیات کی مغربی طور پر زندگی کے حوالے سے خوبصورت عکاسی کی ہے۔

تقسیم کے بعد آدرش کی ٹوٹ پھوٹ کا المیہ بیان کیا ہے لیکن وہ لوگ جو خوابوں میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماضی کو یاد کرتے ہیں۔ ان کا ناسٹلجیا اس کی بہترین مثال ہے۔

قراۃ العین حیدر کے ناول سفینۂ غم دل اور آگ کا دریا میں بھی ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ سفینۂ غمِ دل کا موضوع بھی تحریکِ آزادی اور ملک کی تقسیم سے جنم لینے والے فسادات اور ہجرت کے تجربے ہیں۔

ناسٹلجیا کا بار بار احساس تقسیمِ ہند کے نتیجے میں نظر آتا ہے۔ آگ کا دریا میں عہدِ حاضر کی جھلکیاں جن میں جنگیں، فسادات، سرحدوں کی تقسیم، غریب الوطنی، نسلی تعصبات، تہذیبوں کا تصادم، انسانی حقوق کا استحصال، مسئلہ جبر و قدر، تاریخ کی حشر سامانیاں اور مختلف فلسفوں کے انسانی فکر و عمل پر اثرات سب نظر آتا ہے۔ ناول کا آغاز ہی ٹی۔ ایس ایلیٹ کی نظم *Four Quarters* ظاہر کرتی ہے جس میں وہ کہتا ہے:

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقت ور ریٹالا دیوتا ہے۔ تند مزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اور اپنے غیض و غضب کا مالک، تباہ کن
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنھیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں۔
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے۔
دریا ہمارے اندر ہے سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔
خاتمہ کہاں ہے بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھاتے پھولوں کا
جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے
خاتمہ کہیں نہیں ہے۔ صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھٹنوں کا گھٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے لمحوں کو ڈھونڈ نکالا
(سوال یہ نہیں کہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا۔ یا غلط چیزوں کے خوف کا)
یہ لمحے مستقل ہیں جس طرح وقت مستقل ہے۔
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسروں کے کرب میں بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے۔۔۔۔[۳۴]

ٹی۔ایس۔ایلیٹ کا کہنا ہے کہ حال، ماضی میں بھی شریک ہے اور مستقبل میں بھی۔ یعنی لمحہ موجود گزشتہ اور آئندہ سے جڑا ہوا ہے۔ آج کا حال کل کا ماضی ہے۔

عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں ناسٹلجیا کی واضح جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اس میں نہ صرف برصغیر کی تاریخ کے کئی ادوار کو تہہ در تہہ کھولا گیا بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی شہر اور دیہات کے افراد پر کیسا اثر چھوڑ دیتی ہے۔ عبداللہ حسین نے برصغیر کے ان پسماندہ انسانوں کی بے بسی اور لاچاری کو پیش کیا ہے جن کو برطانوی غلامی اور افلاس نے مضمحل، شکستہ، اعصاب زدہ اور ستم دیدہ کر دیا تھا۔ برطانوی سامراج برصغیر کا بری طرح استحصال کر رہے تھے۔ عوام حصول آزادی کی خاطر قربانیاں دے رہے تھے۔ جان قربان کر رہے تھے۔ شہر اور بستیاں ویران، تباہ و برباد ہو گئیں۔ گاؤں راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ بچوں کا خون بہایا گیا۔ عورتوں کی تذلیل کی گئی۔ اغواء کیا گیا، انسانیت کی تذلیل کی گئی۔ ریل گاڑیوں میں انسانوں کی سر بریدہ لاشیں تھیں۔ عبداللہ حسین ہجرت کے واقعات اور کیمپوں کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے، جاتے جاتے انھوں نے بلوائیوں کی جھلک دیکھی تو وہ لمبے تڑنگے سکھ کسان اور چھوٹی ذاتوں کے کالے کالے لوگ تھے جو ان کا سامان نکل کر لان میں جمع کر رہے تھے اور آگ لگا کر بھنگوں کی طرح شور مچا رہے تھے۔[۳۵]

انتظار حسین بار بار ماضی سے اپنے آپ کو تلاش کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص انداز میں، اپنی جڑوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناسٹلجیا کی مثالیں ان کے نمائندہ ناولوں بستی، تذکرہ اور آگے سمندر ہے میں ملتی ہیں۔

بستی میں ناسٹلجیا موضوعاتی جدت کے ساتھ ایک نیا رخ دکھاتا ہے اس میں تکنیک، اسلوب اور ہیئت سب کچھ تبدیلی سے ہمکنار نظر آتے ہیں۔ داخلی خود کلامی بھی ہے۔ بستی میں روپ نگر کو چھوڑ کر آنے کا جو پچھتاوا ہے اسے انتظار حسین اپنے ناول کے کردار ذاکر کے الفاظ میں دھو ڈالتے ہیں۔ فطری طور پر انسان اپنے ماضی کو بھول نہیں سکتا اور یہ کوئی ذہنی بیماری نہیں ہے۔ ناسٹلجیائی یادیں ہجرت کرنے والوں کا حقیقی اور فطری سرمایہ ہوتی ہیں۔

فہیم اعظمی کے ناول جنم کنڈلی میں بھی ناسٹلجیائی حوالے پائے جاتے ہیں۔ بے یقینی، تشکیک، بے اعتمادی اور ہمہ گیر نا آسودگی کا شکار ہے۔ جوگندر پال کے ناول خواب رو میں ناسٹلجیا ہجرت کے حوالے سے ملتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کے بعد پیش آنے والے مسائل کا ذکر ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ ہجرت اور بے جڑی انسان کا مقدر ہے۔ اس سے حاصل ہونے والا دکھ بھی انسان کا مقدر ہے مگر انسان نئی سرزمین سے سمجھوتہ کر کے اس کرب پر

TH 2334

قابو پاسکتا ہے۔

الطاف فاطمہ کے ناول چلتا مسافر اور افسانوی مجموعے میں بھی ناسٹلجیا اور ہجرت کا کرب یا المیہ موجود ہے۔ انھوں نے معاشرے میں بڑھتی ہوئی غیریت اور تنہائی کے احساس کو اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں انسانی شناخت، وقت کی جبریت اور معاشرتی عدم تحفظ جیسے موضوعات غالب نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد پروان چڑھنے والی نسل کے ذہنی و فکری رویوں کو اسی طرح سے پیش کرتی ہیں کہ ماضی ایک توانا حوالہ بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ بقول غلام حسین اظہر:

> الطاف فاطمہ نے حال کے ہنگامے اور آشوب سے جلتی ہوئی روحوں کی حسرتوں اور مایوسیوں کے زخموں کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ جنھیں وقت کی ہر لہر مند میل کرنے کی بجائے اور زیادہ گہرا کر دیتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے مایوسیوں اور افسردگیوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایسی فضا تخلیق کی ہے جس سے ابھرنے والی لہریں اور جدید کے جوار بھاٹا کی پیدا کردہ ہیں لیکن جس ساحل سے وہ ٹکرا رہی ہیں وہ ساحل مشرقی دل ہے جو محبت، انسانی رشتوں کے تقدس اور احترام سے عبارت ہے۔[۳۶]

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں بھی ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار وقت اور حالات کی تلخیوں سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لیتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کی ذہنی کیفیات کو افسانے میں پیش کر کے در حقیقت اس درد اور کسک کو واضح کرتی ہیں جن سے وہ کردار دوچار ہوتے ہیں بقول ڈاکٹر محمد عالم:

> ان کے کردار ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ الطاف فاطمہ وقت کی بے قدری سے نالاں ہیں اور ماضی ان کے لیے عظیم سرمایہ ہے جسے وہ رہ رہ کر یاد کرتی ہیں۔[۳۷]

ان کے افسانوں میں یادوں کا حسن اور ان سے تشکیل پانے والی انوکھی فضا موجود ہے۔ ان کے ہاں ماضی کے حسین خواب، پرانی یادیں اور ماضی کی رفاقتیں جھلکتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کو حسین اور دائمی دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے انسانی جذبوں میں محبت اور پیار کے خالص رنگوں کی متلاشی ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ناولوں میں ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔ ان میں مستنصر حسین تارڑ کا بہاؤ اور راکھ، بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، عزیز احمد کا ایسی بلندی ایسی پستی، خدیجہ مستور کا آنگن اور زمین، الطاف فاطمہ کا نشانِ محفل، انیس ناگی کا دیوار کے پیچھے، شوکت صدیقی کا خدا کی بستی، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اور سلمیٰ اعوان کا تنہا وغیرہ شامل ہیں۔

ناولوں کے علاوہ افسانوں میں بھی ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔ قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے ناولوں

کے علاوہ افسانوں میں بھی ناسٹلجیا شامل ہے۔ انتظار حسین کے افسانے محل والے اور ہندوستان سے ایک خط میں ناسٹلجیا شامل ہے۔ رشید امجد کے افسانوں ایک کہانی اپنے لیے اور تلاش میں ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانے شیر دھان، مچھلی، ننگی مرغیاں اور تارِ عنکبوت میں ناسٹلجیائی رجحان نظر آتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں وقت کے گزرنے کا کربناک احساس ملتا ہے۔ یہ احساس ہر لمحہ انھیں احساس زیاں سے دوچار کیے رکھتا ہے۔ دراصل وقت ہوا کے ایک جھونکے کی مانند ہے جو کسی کے روکنے سے نہیں رکتا۔ البتہ گزرے ہوئے لمحات اور ان کی یادیں انسان کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں اور وقتاً فوقتاً انسان کو ماضی کے ان لمحات میں دوبارہ واپس لے جاتی ہیں۔ افسانہ تارِ عنکبوت کا کردار سکندر بخت وقت کے ہاتھوں یکسر بدلا ہوا کردار ہے۔ گزرتے لمحات نے اسے جن تغیرات سے دوچار کیا وہ سب نقش اس کے چہرے سے عیاں ہیں۔

> اگرچہ ظاہری قد کاٹھ اور وضع میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ تھی لیکن اندرونی ٹوٹ پھوٹ چہرے سے آشکارا تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے تمام آئینے ٹوٹ پھوٹ کر کرچ کرچ ہوئے اور اب وہ انھیں اپنے اندر سنبھالے پھرتا ہو۔ پھر وہ اس کی غلافی آنکھوں تلے ابھرتی بلڈ پریشر کی سرمئی تھیلیاں پیشانی سیاہ گھونگھریالے بالوں سے محروم اور رہے سہے بالوں پر وقت کی دھول تہ بن کر جمی ہوئی۔[۳۸]

مجموعی طور پر اردو افسانہ نگار جن کی تحریروں میں ناسٹلجیائی رجحان پایا جاتا ہے ان میں سے چند ایک نام یہ ہیں۔ انتظار حسین، قراۃ العین حیدر، مسعود اشعر، امراؤ طارق، رام لعل، ام عمارہ، شہزاد منظر، نورالہدیٰ شاہ، اختر جمال، آغا اشرف، مظہر الاسلام اور مسعود مفتی وغیرہ ان تمام افسانہ نگاروں کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان پایا جاتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی اگرچہ بہت بڑے مزاح نگار ہیں لیکن ان کی تحریروں میں بھی ناسٹلجیائی رجحان ملتا ہے۔ ان کی کتاب آبِ گم میں تو ناسٹلجیا اس حد تک دکھائی دیتا ہے کہ وہ خود کہتے ہیں کہ اس مجموعے کے بیشتر کردار ماضی پرست ہیں اور ان کا اصل مرض ناسٹلجیا ہے۔

ناسٹلجیا کی ایک صورت خود اختیار کردہ مہاجرت کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں مسائل میں پیچیدگی مسلسل چلی آرہی ہے لہٰذا لوگوں کے یہاں اپنے ماحول سے غیریت، بیگانگی اور ناسٹلجیا پیش در پیش چلا آرہا ہے۔ نظام جبر، جمہوری قدروں کی پامالی اور غربت و بے روزگاری کی وجہ سے عموماً لوگ یورپی ممالک کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اپنے اپنے خاندان کے لیے زرمبادلہ کمانے کی فکر میں تمام زندگی وطن سے دور گزارتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ہاں ناسٹلجیا جنم لیتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد شاعروں کے ہاں بھی سب سے بڑا موضوع ہجرت کا نوحہ اور ماضی کی یادیں تھیں۔ یہی

وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھی ہمیں ناسٹلجیائی کیفیات ملتی ہیں۔ اس حوالے سے ناصر کاظمی، احمد مشتاق اور منیر نیازی کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ فیض احمد فیض اپنے دوست کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنون عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم۔[۳۹]

احمد مشتاق اس درد آشوب کو اس طرح اپنے الفاظ میں سموتے ہیں۔

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں، کوئی کہیں رہتا ہے
جن کا وجود تھا سر و سامان زندگی
اے زندگی وہ بے سر و ساماں کہاں گئے
چپکے چپکے یوں گزرتی ہے گئے لمحوں کی یاد
چاندنی راتوں میں جیسے سست دریا کا بہاؤ۔[۴۰]

ناصر کاظمی ان لوگوں کو یاد کرتے ہیں جنھیں وہ انبالہ چھوڑ کر آئے تھے۔ ساون کے موسم کے ساتھ، یادوں کا ایک طویل سلسلہ جڑا ہے جو انھیں بے چین رکھتا ہے چنانچہ برسات وہ اپنے بیتے دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
پھر گونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے

منیر نیازی کے ہاں بھی ماضی کی یاد اور اس کا نوحہ سنائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں گزرے زمانے کی محفلوں اور دوستوں کی رفاقتوں کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
آنکھوں میں اڑ رہی ہے کئی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

مجید امجد دور کے پیڑ زندگی کے بے نشاں خوابوں کی دھند میں ان آرزوؤں، بستیوں، پیڑوں اور شاخوں کی یاد کرتے ہیں جو کہ ایک صدائے بازگشت بن کر رہ گئے ہیں۔

ریتلے ٹیلوں کی ڈھلوانوں کے پار
وہ رہا میرا نشیمن، دور ادھر
کھیلتا ہے جس کے بام و در کے ساتھ
ٹیکری سے در ادھر، اک نور ادھر
نور اک رنگین دھوئیں کی طرح نور
روشنی ایک گل بداماں روشنی
میں تجھے ڈھونڈوں کہاں ڈھونڈوں کہاں
میری نظروں سے گریزاں، روشنی

ناسٹلجیائی رجحان صرف فکشن اور شاعری تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ یہ موضوع تو ڈراموں اور فلموں میں بھی مقبول ہے مثلاً Spiderman film series اور Film series Harry Potter میں بھی ناسٹلجیا کے موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔

غرض یہ کہ ناسٹلجیا کا موضوع نہ صرف شعر و ادب کی دنیا تک محدود ہے بلکہ اس کا تعلق اور دائرہ کار میڈیا کو بھی متاثر کیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناسٹلجیا کا موضوع خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو جائے اس کو نئے انداز میں پیش کیا جاتا رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ قاضی جاوید، "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" مشمولہ ماہ نو (اکتوبر ۱۹۸۰ء)، ص ۲۲۔۲۷۔

۲۔ انتظار حسین، اردو کا مختصر افسانہ پاکستان میں، مطبوعہ سیپ ۱۲ (خاص نمبر)، ص ۳۔۵۔

۳۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۰۔

۴۔ مشتاق احمد یوسفی، آبِ گم (کراچی: مکتبہ دانیال، بار ششم، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۹۔

۵۔ www.wikipedia.org/wiki/nostalagia بتاریخ ۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۱۵۔

۶۔ www.allencounlyky.com/infolod.disense.html بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۲۰۔

۷۔ dictionary.cambridge.org/dictionary بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۲۲۔

۸۔ www.wikipedia.org/wiki/nostalagia بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۳۵۔

۹۔ David B. Guralnifon, websters, *New word Dictionary of the American language*, David B.Guralniform, the word publishing company, New York & Cleveland، ص ۹۷۳۔

۱۰۔ *Advanced Practical Dictionary* (English to English and Urdu) with brief general knowledge, azhar Publishers, Lahore, Pakistan، ص ۸۵۲۔

۱۱۔ www.oxforddictionary.com، بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۵۰۔

۱۲۔ www.urbandictionary.com بتاریخ ۲۵ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۷:۰۰۔

۱۳۔ شان الحق حقی (مترجم)، آکسفورڈ اردو ڈکشنری (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۱۱۔

۱۴۔ www.allencounlyky.com/infor/old.disease.html بتاریخ ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۵:۰۰۔

۱۵۔ www.wikipedia.org/wiki/nostalagia بتاریخ ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۵:۱۲۔

۱۶۔ Ibid، بتاریخ ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۵:۲۵۔

۱۷۔ www.nostalagia.com بتاریخ ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۵:۳۰۔

۱۸۔ www.wikipedia.org/wiki/nostalagia بتاریخ ۲۷ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۵:۴۰۔

۱۹۔ Theimaginal Past (انگلینڈ: لنکن پریس، ۱۹۸۰ء)، ص ۹۰۔

۲۰۔ محمد عاصم بٹ، عبداللہ: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۸۔

۲۱۔ مشتاق احمد یوسفی، آبِ گم، ص ۲۰۔

۲۲۔ احمد سہیل، اردو افسانے کا ناسٹلجیا (ملتان: تدوین پبلی کیشنز، س۔ن)، ص ۳۲۔۳۳۔

۲۳۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۷ء)، ص ۷۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۴۳۔

۲۵۔ قراۃ العین حیدر، خصوصی مطالعہ، مرتبین سید عامر سہیل، ڈاکٹر علی اظہر (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء)، ص ۵۱۲۔

۲۶۔ www.medicalnewsday.com بتاریخ ۲۹ جنوری ۲۰۲۰ء، بوقت ۶:۰۰۔

۲۷۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک) (کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۰۳۔

۲۸۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۷ء)، ص ۱۳۵۔

۲۹۔ عبادت بریلوی، "اردو ادب میں جدید رجحانات" مشمولہ مقالات (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۳ء)۔

۳۰۔ سید سجاد حیدر یلدرم، "جہاں پھول کھلتے ہیں" مشمولہ سجاد حیدر یلدرم مرتبہ قراۃ العین حیدر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۱۷۔

۳۱۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب (ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۵۔

۳۲۔ پریم چند، مجبوری، پریم چند کے بہترین افسانے (س۔ن)، ص ۱۵۔

۳۳۔ روبینہ الماس، اردو افسانے میں جلا وطنی کا اظہار۔ ص ۲۰۔

۳۴۔ قراۃ العین حیدر، آگ کا دریا (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۔

۳۵۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء)، ص ۴۹۶۔

۳۶۔ روبینہ شہناز، اقلیمہ ناز، "الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کے عناصر" مشمولہ خیابان (پشاور: جامعہ پشاور، خزاں ۲۰۱۴ء)، ص ۹۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۳۸۔ الطاف فاطمہ، تارِ عنکبوت (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۶۔

۳۹۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (نقشِ فریادی) (لاہور: مکتبہ کارواں، س۔ن)، ص ۵۶۔

۴۰۔ آمنہ ثناءاللہ، احمد مشتاق بحیثیت شاعر۔ غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔اے اردو (فیصل آباد: جی۔سی یونیورسٹی۔ س۔ن)

باب دوم:

الطاف فاطمہ: احوال و آثار

باب دوم:

الطاف فاطمہ: احوال و آثار

الطاف فاطمہ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو لکھنو (یوپی) واقع "اونل ہاؤس" قیصر باغ میں پیدا ہوئیں۔ یہ گھرانہ ہندوستان میں خیر آبادی "سلسلہ علماء" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا سلسلہ نسب خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ ان کے اجداد کا تعلق یوپی کے ایک مشہور قصبے خیر آباد سے تھا۔ خیر آباد ارباب علم و دانش کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ مغل شہنشاہ اورنگزیب نے ایک خط میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "خیر آباد یونان ماست" جنگ آزادی کے بعد ان کے آباؤ اجداد ریاست پٹیالہ میں منتقل ہو گئے۔ ان کے جد اعلیٰ فضل امام خیر آبادی تھے۔ مولانا فضل امام کا گھرانہ بہت مشہور گھرانہ تھا۔ مولانا فضل امام منطق اور فقہ کے جید عالم اور اہل تصنیف تھے۔ الطاف فاطمہ ان کے بارے میں بتاتی ہیں۔

> ان کی تصنیفات آج تک جامع اظہر (مصر) کے نصاب میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس خاندان کے علماء کے فتویٰ کے بغیر مدینہ اور مکہ کے علماء بھی فتویٰ کو مستند قرار نہیں دیتے تھے۔[1]

علامہ فضل امام کے بڑے صاحبزادے علامہ فضل حق خیر آبادی ۱۲۱۱ھ مطابق ۱۷۹۶ء، ۱۷۹۷ء میں خیر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ برصغیر کے معروف عالم دین اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نامور مجاہد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریزوں نے ان پر غدر کا مقدمہ چلا کر "جس دوام باعبور دریائے شور" کالا پانی کی سزا دی تھی۔ وہ منطق فلسفہ، ادب، کلام و اصول، شعر و شاعری اور علوم دینیہ میں اہم مقام رکھتے تھے۔ قید و بند کی صعوبت کے دوران انھوں نے اپنا مشہور قصیدہ "السورۃ الہندیہ" لکھا تھا۔ ان کی وفات قید فرنگ میں ہی ہوئی۔

فضل حق خیر آبادی کے دو بیٹے تھے۔ مولوی فضل حکیم خیر آبادی اور فضل عظیم خیر آبادی۔ الطاف فاطمہ کے پردادا محمد فضل حکیم ریاست پٹیالہ میں مالیات کے محکمے میں ملازم تھے اور بتدریج وزیر مالیات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ الطاف فاطمہ کے دادا محمد فضل متین ان کے بڑے تھے اور ریاست پٹیالہ ہی میں جج کے منصب پر فائز تھے۔ وہ بھی اہل قلم تھے۔ ان کا تحریر کردہ ایک رسالہ ہے جو طاعون کے مرض اور انسداد کے بارے میں تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں "خان بہادر" کا خطاب دیا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں تھا۔

محمد فضل متین صاحب بہت ایماندار جج تھے۔ اسی وجہ سے سب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ خاص طور پر

مہاراجہ پٹیالہ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ پٹیالہ میں ان کی عالیشان کوٹھی جو "شبستان متین" کے نام سے جانی جاتی تھی۔ یہیں الطاف فاطمہ کا بچپن گزرا۔ بقول وکیل انجم:

> پٹیالہ کے جس گھر میں وہ رہتی تھیں ان کا نام "شبستان متین" تھا۔ جس کی یاد آج بھی الطاف فاطمہ کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ الطاف فاطمہ کے اکثر افسانوں میں ماضی پرستی اور قدیم روایات کی جو بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے "شبستانِ متین" سے جڑا نظر آتا ہے۔[۲]

الطاف فاطمہ کے والد محمد فضل امین، محمد فضل متین کے بڑے صاحب زادے تھے۔ الطاف فاطمہ کے خاندان کے مردوں کا سابقہ فضل ہے۔ خاندان کے ہر لڑکے کا نام کا پہلا حصہ "محمد فضل" رکھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ علامہ فضل امام خیر آبادی سے نسبت ہے۔ الطاف فاطمہ کی دادی کا نام محمد جہاں بیگم تھا جو ان کے والد کی کم سنی میں وفات پا گئیں اور دادا کا دوسرا عقد ان کی ہی بھانجی سے ہوا۔

الطاف فاطمہ کے خاندان کو ریاست پٹیالہ میں خدمات کے طور پر ایک قصبہ "سنور" کی ملکیت دی گئی تھی۔ سرہند میں بھی کچھ باغات تھے۔ بقول الطاف فاطمہ ان کے خاندان کی تمام خواتین نہ صرف پڑھی لکھی تھیں بلکہ علم و ادب سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان کی کی بڑی پھوپھی امت الروؤف بیگم نواب سعید الدین (وزیر ریاست گوالیار) کی اہلیہ تھیں۔ ان کو اوائل عمری سے ڈائری لکھنے کا شوق تھا۔ ان کے افسانے بھوپال سے شائع ہونے والے معروف ادبی رسالے "محلِ سلطان" میں چھپتے تھے۔ افسانوں کا مجموعہ "ہدیہ نسواں" ہے۔ آل انڈیا وومن کانفرنس کی ممبر تھیں۔

خواتین بہت شوق سے مطالعہ کرتی تھیں۔ اس دور میں خواتین کے تقریباً تمام رسالے ان کے گھرانے میں آتے اور پڑھے جاتے تھے۔ علامہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کی تمام تصانیف کے علاوہ عصمت، تہذیب نسواں اور خواتین کے دوسرے ادبی رسالے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ گھریلو ملازمین کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بھی خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔

الطاف فاطمہ سیّد شہاب دہلوی کی عزیزہ ہیں۔ الطاف فاطمہ ہمیشہ شہاب دہلوی کا ذکر بہت پیار سے کرتی تھی۔ آرٹ کونسل کے زیرِ اہتمام "شہاب دہلوی کے ساتھ ایک شام" تقریب منعقد کی گئی۔ کسی معروضیت کی بنا پر الطاف فاطمہ نہ جا سکی لیکن تقریب کے لیے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے شہاب کا ذکر بھائی کے طور پر کرتی ہیں۔ ان کے درمیان احترام کا رشتہ تھا۔ ان کے دادا میر حسن رضوی جو دو اخبار "خیر خواہ" اور "چلتا پرزہ" اپنے دور میں نکالتے رہے۔ ان کے والد نے حضرت اویس قرنی کے حالاتِ زندگی کا ترجمہ فارسی میں کیا اور بھی بہت زیادہ تصانیف کا ترجمہ کیا تو شہاب دہلوی نے بھی اسی راہ کو اپنایا۔ بہاولپور میں علمی اور ادبی ماحول کی تشکیل میں مصروف

رہے۔ دو دو اشاعتوں الہام اور انزبیر کے اجراء کی سہولتیں پیدا کیں۔

اسی مضمون میں الطاف فاطمہ نے ان کے والد چچا منظور حسین صاحب کا ذکر کیا ہے کہ وہ جب بھی آتے، ان کی والدہ ان کا بڑا احترام کرتی تھیں۔ الطاف فاطمہ کے مطابق چچا صاحب متین اور کم سخن تھے۔ لیکن ان کی نگاہ و خیال کی شفقت ناقابلِ فراموش ہے۔ وفات سے قبل والدہ نے دعوت پر بلایا۔ اس دن وہ معمول سے زیادہ ہمارے درمیان رہے۔ والدہ کو ایک دعا بخشی۔ درد دور کرنے کے لیے خاموش ضرور تھے لیکن گفتگو میں شگفتگی اور مزاح کی کیفیت اس قدر تھی کہ ہم لگو تو خیر بڑے ہوئے، میری بڑی ہمشیرہ کے دونوں بچے عمر اور حمیدہ بھی رویدگی سے ان کے قریب بیٹھتے اور ان کی باتیں دلچسپی سے سنتے۔ چند ہی روز بعد ان کی وفات کی خبر ملی تو بڑا غم ہوا۔ یہ سوچ کر کہ ابا کا ایک بے لوث حوالہ ختم ہوا اور اب کون کمال شفقت سے بھائی فضل امین کے بچوں سے ملنے آنے کا اہتمام کر کے آئے گا اور واقعی کچھ عرصے ایک طرح سے یہ ربط ٹوٹا۔

الطاف فاطمہ کے والد کا نام محمد فضل امین اور والدہ کا نام سیدہ ممتاز جہاں بیگم تھا۔ فضل امین علی گڑھ یونی ورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے ایم۔اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کیا۔ مغربی اور فارسی ادب میں دلچسپی ہونے کی وجہ سے ان پر گہری نظر تھی۔ دینی علوم کا مطالعہ بھی بڑے لگاؤ سے کرتے تھے۔ دورانِ تعلیم اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر تھے۔ یونی ورسٹی یونین کے وائس پریزیڈنٹ رہے۔ آزادی کے لیے انگریز حکومت کے خلاف باغیانہ تقاریر بھی کرتے تھے۔ اس سے قبل سکول کے زمانہ میں مولانا حسرت موہانی کے رسالے سے فرضی نام سے انقلابی مضامین لکھ کر شہرت پائی۔

الطاف فاطمہ بتاتی ہیں کہ وہ انگریزی اور فارسی بولنے میں اہلِ زبان کی طرح مہارت رکھتے تھے۔ بہت کم عمر ۳۳ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ وفات کے وقت مالوے کی ایک ریاست جاورہ میں اسسٹنٹ چیف سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی پر عبور رکھنے کی بنا پر نواب جاورہ کے بیٹوں کے اتالیق تھے۔ جب اُن کے والد وفات پا گئے۔ الطاف فاطمہ بہت کم سن تھیں۔ اپنے والد کے بارے میں کہتی ہیں:

> وہ کیسے تھے؟ کیا تھے؟ بس ایک بے حد خوش شکل، وجیہہ اور اعلیٰ قسم کا لباس پہننے والی شخصیت کا تصور اب بھی دل میں سمایا ہوا ہے۔ شاید بہت کم دیکھا اور واسطہ رہا۔ اس لیے ایک متاعِ عزیز کی طرح آب دار موتی کی یاد ہے جو رہ رہ کر ذہن کے پردے پر دمکتی ہے۔ وہ ایک شعلہ مُعجل تھے۔ [۳]

اپنے والد کی وفات کے بارے میں کہتی ہیں:

> ان کی وفات کے وقت ہم بہت کم سن تھے۔ میری بہن کی ولادت تو ان کی وفات کے چار ماہ بعد ہوئی۔ [۴]

والد کی وفات کے بعد فوراً ان کے دادا بھی انتقال کر گئے۔ فضل امین کی شادی خان بہادر سید حفصہ حسین کی صاحب زادی سیدہ ممتاز جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کا تعلق بھی لکھنو سے تھا۔ ان کے نانا اپنی بیٹی اور اس کے چار بچوں کو اپنے ساتھ لکھنو لے آئے۔ الطاف فاطمہ اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے ساتھ قیامِ پاکستان تک مقیم رہیں۔ ننھیالی خاندان بھی ان کی زندگی اور فکر پر بہت اثر انداز ہوا۔ ننھیالی پس منظر بھی ددھیال کی طرح بہت اہمیت کا حامل ہے۔

الطاف فاطمہ کا ننھیال سیّدوں کا خاندان تھا۔ شجرۂ نسب کئی پشتوں کے بعد نبی کریم ﷺ سے جاملتا ہے۔ یہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا۔ پھر بدخشاں سے کابل کے راستے آکر ضلع اٹک میں قیام پذیر ہو گیا اور پھر وہاں سے دہلی چلا گیا۔ بعد ازاں سرہند سے ہوتا ہوا لکھنؤ چلا گیا۔ ان کے ننھیال کے بزرگوں نے دین کی تبلیغ میں بہت حصہ لیا۔ جن میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز اور ہرے بھرے شاہ شامل ہیں۔ ہرے بھرے شاہ کا مزار دہلی میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے قریب ہے۔

ان کے خاندان میں دو مشہور ادیب سیّد حسین شاہ اور شاہ حسن بھی تھے۔ سید حسین شاہ کی تصنیف مثنوی ہشت گلزار اردو ادب میں اہمیت کی حامل ہے جب کہ شاہ حسن نے داستان گوئی پر تصنیف نثتر لکھی۔ شاہ حسن کے بیٹے سیّد محسن علی شاہ، الطاف فاطمہ کے پرنانا تھے۔ انھوں نے سراپا سخن کے نام سے کتاب لکھی تھی۔ مرزا غالب نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی اس کاوش کو سراہا تھا۔ بقول الطاف فاطمہ کچھ سال پہلے اٹلی کی ایک یونی ورسٹی میں اس پر ایک مقالہ لکھا گیا تھا۔

سیّد محسن علی شاہ کے تیسرے بیٹے سیّد جعفر حسین شاہ الطاف فاطمہ کے نانا تھے جو پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ نانا کے بڑے بھائی سید محمد حسین انگلستان سے زراعت کی تعلیم حاصل کر کے آئے اور ڈائریکٹر ایگری کلچر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے منجھلے بھائی سیّد علی حسین ایک بڑے عالم تھے اور ان کا ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ انھیں ہمیشہ خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رہتا تھا۔ الطاف فاطمہ کے نانا کی بہن حافظِ قرآن، خطاطی میں ماہر تھیں۔ تفسیر قرآن پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کی تربیت کی بدولت الطاف فاطمہ کی والدہ اور خالائیں علم و دانش میں اپنی مثال آپ ہوئیں۔ خطاطی میں بھی انھیں کمال حاصل تھا جبکہ فارسی کی مثلیں، حافظ اور سعدی کے اشعار ان کی نوکِ زباں ہوتے تھے۔ جدید اور سیاسی علوم سے بھی آگاہ تھیں۔

الطاف فاطمہ کے نانا نے ترکی کے انجینئرنگ کالج سے تعلیم پائی تھی اور آب پاشی کے محکمہ میں ملازم تھے۔ وہ نہروں اور تعمیرات کے شعبے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ حیدر آباد دکن اور بھوپال میں ان کی تعمیرات آج بھی قابلِ دید ہیں۔

الطاف فاطمہ کے دونوں ماموں خان بہادر سید حامد حسین اور سید فیض حسین جعفری بھی ماہر انجینئر تھے۔ بھارت کی مشہور سارده کینال کی تعمیر میں ان دونوں کا اہم کردار ہے۔ سید رفیق حسین اردو ادب میں پہلی بار علامتی افسانہ نگار کے طور پر آئے۔ ان کے افسانے اردو ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔

سیّدہ ممتاز جہاں بیگم تعلیم یافتہ مذہبی خاتون تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد انھوں نے بچوں کے لیے ماں اور باپ دونوں کا کردار ادا کیا۔ وہ باہمت اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ اپنے بچوں کو ہر قسم کی احساس محرومی سے دور رکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی والدہ نے اپنے بچوں کو مہذب زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھایا۔ پریشانی میں کثرت سے مطالعہ کرتی تھیں۔ کسی سے بھی اپنی پریشانی کا ذکر نہ کرتیں۔ کھیل کھیل میں اپنے بچوں کو اس قدر اچھی معلومات فراہم کرتی تھیں کہ مطالعے سے اتنی معلومات حاصل نہ ہوتیں۔ اپنے بچوں میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور پیدا کر کے انھیں معاشرے کا فعال رکن بنا گئی۔ الطاف فاطمہ کی والدہ کا انتقال نومبر ۱۹۶۴ء میں ہوا۔

الطاف فاطمہ پانچ بہن بھائی تھے۔ ان کا دوسرا نمبر ہے۔ سب سے بڑی بہن ارشاد فاطمہ تھیں۔ جن کا انتقال ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ بہت اچھی مصورہ تھیں۔ اس کے بعد بھائی فضل قدیر جو اردو ادب کے بہت اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ "ماہ نو" کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ اردو ادب میں بلند پایہ صحافی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انفارمیشن منسٹری میں پبلی کیشن (Publication) کے شعبے سے منسلک رہے۔ پاکستان بننے کے بعد ہر قسم کی مالی مشکلات کے باوجود انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔اے جرنلزم کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ الطاف فاطمہ اور ان کے بھائی نے ابتدائی تعلیم ایک ہی سکول سے حاصل کی۔ ان کے درمیان بہت پیار و محبت تھی۔ ہر وقت بھائی کی یاد خصوصاً کوئی کتاب پڑھتے وقت بھائی کی شدت سے یاد آتی تھی۔ دل چاہتا ہے کہ کسی طرح انھیں واپس لے آؤں۔ الطاف فاطمہ کہتی ہیں کہ ہم جو بھی پڑھتے بھائی کو بتاتے، اب بھائی نہیں ہیں تو ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی فضل حق جو دو سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور سب سے چھوٹی بہن نشاط فاطمہ بھی ممتاز ناول نگار ہیں۔ بہت حساس اور سنجیدہ فطرت کی حامل تھیں۔ جانوروں کو پالنے کا بہت شوق تھا۔ ان کا قیام مشرقی پاکستان میں رہا۔ بنگال کی غریب اور عام انسان کی زندگی کی مشکلات کا شدت سے احساس تھا۔ الطاف فاطمہ کہتی ہیں:

> سچ پوچھیے تو اسی ہمدردی نے انھیں افسانہ نگار بنایا۔ ان کا دائرہ وسیع تھا اور وہ ہر قسم کے ملکی اور غیر ملکی لوگوں کے قریب رہیں اور ان کا مطالعہ کیا۔ یہ جذبہ ان کی ہر تصنیف سے ظاہر ہے۔[۵]

نشاط فاطمہ کا ناول آنسو جو بہہ نہ سکے بہت مقبول ہوا۔

تعلیم اور ملازمت:

الطاف فاطمہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ ان کے ماموں زاد بھائی محمود حامد جو لکھنو سے بی۔اے آنرز کر کے آئے تھے۔ ان کے گھر میں ہی رہتے تھے۔ الطاف فاطمہ نے ابتدائی تعلیم کا آغاز انگریزی سے کیا۔ محمود صاحب کے استاد نے جب الطاف فاطمہ کو انگریزی پڑھتے دیکھا تو ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس بچی کو فارسی پڑھائیں۔ وہ خود بھی فارسی کے استاد تھے۔ یوں وہ فارسی پڑھنے لگیں۔ والدہ نے انگریزی، فارسی کے ساتھ اردو پڑھانے لگیں۔

فارسی آمدن نامہ ان ہی مولوی صاحب سے پڑھا۔ اس کے بعد ایک حافظ جنید احمد صاحب سے گلستان اور بوستان پڑھی۔ زندگی کے بارے میں ان کے نظریات شیخ سعدی کی حکایتوں کی بدولت تقریباً صوفیانہ ہو گئے۔ زندگی کے بے ثباتی اور انسانی اقدار کا ذکر ان کے ناولوں اور افسانوں میں ملتا ہے۔ وہ خود کہتی ہیں:

> شیخ سعدی کے افکار، فلسفہ زیست اور سماجی شعور کا میرے مزاج، فکر اور رویوں میں شروع ہی سے ایک کردار رہا ہے۔ نہ جانے کیوں چھوٹی چھوٹی اور سیدھے سادے انداز میں لکھی حکایتوں نے میرے دل میں دنیا کی وقعت کم کر دی۔[۲]

ریاست جاورہ کے ایک چرچ مشن سکول میں نرسری جماعت میں داخلے سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ ان کے بھائی فضل قدیر بھی ان کے ساتھ ہی سکول میں داخل کرائے گئے۔ دونوں میں بہت پیار و محبت تھا۔ ان کے بھائی کو بعد میں گوالیار کے ایک امریکن سکول میں داخل کرایا گیا۔ الطاف فاطمہ نے ان کی کمی کو بہت محسوس کیا اور اداس رہنے لگیں۔ یہ اداسی ان کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔

اپنے نانا سیّد جعفر حسین کی وفات سے بھی الطاف فاطمہ بہت متاثر ہوئیں کیونکہ وہ بہت حساس فطرت کی حامل تھیں۔ اس لیے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ بالآخر والدہ کے سمجھانے اور بہت مشکلوں کے بعد ۱۹۴۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

الطاف فاطمہ نے تعلیم کا باقاعدہ آغاز لکھنو کے مقامی سکول سے کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئیں۔ تب وہ ایف۔اے میں تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ نہ چھوڑا۔ کبھی ریگولر اور کبھی پرائیویٹ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایف۔اے کا امتحان بھی پرائیویٹ طالبہ کی حیثیت سے پاس کیا۔ ۱۹۵۱ء میں بی۔اے کا امتحان اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ لاہور سے پاس کیا اور ۱۹۵۴ء میں اورینٹل کالج سے ایم۔اے کیا۔ ایم۔اے اردو کے زمانہ طالب علمی میں ہونہار طالبہ قرار دی گئیں۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی لگن اور خودداری کی وجہ سے اساتذہ اور

طالب علم ساتھی انھیں پسند کرتے تھے۔ علمی وادبی فضا میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، صوفی غلام تبسم جیسے ماہر اساتذہ کی شاگردی نصیب ہوئی جنھوں نے ان کی تخلیقی و علمی صلاحیتوں کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے سب استاد ہی بہت شفیق اور مہربان تھے۔ مختلف موضوعات پر ادبی گفتگو کیا کرتے تھے اور بحث و مباحثہ جاری رہتا تھا۔

الطاف فاطمہ نے محکمہ بہبود کی جانب سے Child Welfare کا کورس بھی کیا۔ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے WCA کے کورس میں بھی شریک رہیں مگر کسی وجہ سے شارٹ ہینڈ کو چھوڑ دیا مگر ٹائپنگ کرتی رہیں۔ انھوں نے اقبالیات میں سپیشلائز کیا ہوا ہے۔

الطاف فاطمہ نے ملازمت کا آغاز ۱۹۶۴ء میں کیا۔ ایک نجی سکول میں سب سے پہلے ملازمت کی۔ پہلا تقرر بحیثیت لیکچرار اسلامیہ کالج کوپر روڈ میں ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں بھٹو کے سپیشلائزیشن کے دور میں ان کا تبادلہ ماڈل ٹاؤن کے کسی کالج میں تھا۔ لیکن پانچ (۵) ماہ بعد ان کا تبادلہ اسلامیہ کالج میں طالبات کے اصرار پر ہوا۔ ملازمت کے دوران ان کے مضمون کے نتائج بہت اچھے رہے۔ ۱۹۸۸ء میں اپوا کالج اور پھر ایک پرائیویٹ کالج میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۵ء۔۱۹۷۶ء میں پبلک سروس کمیشن کے ادارے کی ممبر بنیں۔

عادات ومشاغل:

الطاف فاطمہ کی عادات کے بارے میں الطاف فاطمہ خود کہتی ہیں کہ تعلیم یافتہ شرفاء کے خاندان کی خواتین کی عادات کیا ہو سکتی ہیں۔ وہی جو عام طور پر اس ماحول کی لڑکیوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ الطاف فاطمہ کی زندگی پر ان کی والدہ کی تربیت کے بہت اثرات ہیں۔ ان کی والدہ عام گھریلو خواتین سے بہت الگ تھیں۔ تعلیم یافتہ اور زندگی سے گہری محبت رکھنے والی خاتون تھیں۔ باہمت اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ اپنے بچوں کو مہذب زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا۔ پودوں اور جانوروں کو بہت شوق اور لگن سے پالا ہوا تھا۔ پودوں اور جانوروں کی عادات و خصائل کے بارے میں معلومات رکھتی تھیں۔ اگر انھیں ماہرِ حیوانات کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ گھر میں ہر قسم کے جانور طوطے، بگلے اور خرگوش پالے جاتے۔ یہی شوق الطاف فاطمہ میں بھی نظر آتا ہے۔ الطاف فاطمہ نے جانوروں پر کافی افسانے لکھے۔ بقول انتظار حسین:

> اس نے جانوروں کے افسانے لکھے تھے۔ بھانجی نے گائے بھینسوں پر ایک معلوماتی کتاب لکھ ڈالی۔۔ رفیق حسین کی روایت کو الطاف فاطمہ نے کیا خوب نبھایا۔ خیر یہ ضمنی کاروائی تھی۔ اصل میں تو وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں اور افسانے انھوں نے اپنے ماموں سے الگ ہٹ کر آدمیوں کی دنیا کے

لکھے ہیں۔ باقی یہ کہ جانوروں سے انھیں دلچسپی تو رہی ہے بلکہ ایک زمانے تک وہ خود اسی زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ سب گھر والے انھیں گھوڑی کہتے تھے۔ الطاف فاطمہ گھوڑی۔[۷]

ان کی والدہ ان ڈور گیمز یعنی تاش، کیرم بورڈ اور شطرنج بڑے شوق سے کھیلتی تھیں۔ الطاف فاطمہ، ان کے بہن بھائی اور پاس پڑوس کے بچے بھی ان مشغلوں میں شریک رہتے تھے۔ الطاف فاطمہ سے جب ان کے بچپن کے بارے میں سوال کیا گیا تو وہ کہتی ہیں:

میں ایک عرصہ تک نہایت لاابالی اور کھیل کود میں مصروف تھی۔ میرے تمام مشاغل لڑکوں جیسے تھے، ہر قسم کی شرارتیں اور نکما پن خاص تھیں مگر تیری والدہ نے کبھی تنبیہ نہ کی اور نہ ہی اس بات کی فکر کی کہ اس کا آگے چل کر کیا ہوگا۔۔۔۔ ہمارے زمانے میں لڑکیوں پر کسی قسم کی بندش اور پابندیاں نہیں تھیں کہ لڑکیاں کسی قسم کی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتی تھیں۔[۸]

الطاف فاطمہ بچپن میں اچھلنا کودنا پسند کرتی تھیں اور ہر وقت کھیل کود میں مصروف رہتی تھیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا اور نہ ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ انتظار حسین الطاف فاطمہ کے بچپن کے بارے میں کہتے ہیں:

الطاف فاطمہ گھوڑی بھی ایک بڑونگی تھی۔ کبھی درخت پر چڑھی نظر آتی، کبھی گلی ڈنڈا کھیلتی دکھائی دیتی، کبھی لکڑی کی تلوار بنا کر جنگ لڑ رہی ہے نہ پڑھنا نہ لکھنا، پس ڈنڈے بجانا اور کھیل کھیلنا اور کھیل بھی سب مردانے۔[۹]

الطاف فاطمہ بچپن میں سب مردانہ کھیل کھیلتی تھی۔ لڑکیوں کے کھیلوں میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب بھی کسی سے الطاف فاطمہ کے بچپن کے بارے میں سوال کیا جاتا تو سب یہی کہتیں کہ وہ مردانہ کھیل کھیلتی تھی۔ بقول انتظار حسین:

جس خاتون لکھنے والی سے بات کرو وہ یہی بتاتی ہے کہ بچپن میں وہ مردانہ کھیل کھیلتی تھیں۔ پتنگ بازی، گلی ڈنڈا، درختوں پر چڑھنا۔ کوئی یہ نہیں کہتی کہ اس نے گڑیاں بھی کھیلی ہیں، تو کوئی ماہر نفسیات ہی تجزیہ کر کے بتائے گا کہ تہہ میں کیا بات ہے۔[۱۰]

الطاف فاطمہ کو بچپن میں پڑھنے لکھنے کا بالکل بھی شوق نہیں تھا لیکن جوانی میں قدم رکھتے ہی انھیں مطالعے کا شوق ہو گیا۔ خاموشی رہتی تھیں مگر مطالعہ جاری رکھتیں۔ ہر وقت کتابیں پڑھتیں، اسی وجہ سے مطالعہ ان کا اہم مشغلہ بن گیا۔ ہمیشہ مطالعے میں مصروف رہنے کی وجہ سے خاموش رہتی تھیں۔ بقول انتظار حسین:

خیر یہ لڑکی اچھلتی کودتی تو تھی مگر بولتی نہیں تھی۔ ہمیشہ چپ جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ ہڑونگی مگر گونگی۔[۱۱]

اخبار بہت کم پڑھتی تھیں۔ خط کا جواب ضرور دیتی تھیں۔ "الزبیر" کا شہاب نمبر ملا اور خط کا جواب بھی دیا اور

ان کی تحریروں کی تعریف اس طرح کی کہ جس سلیقے اور محنت سے یہ نمبر نکالا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ تبصرہ کروں۔ شہاب بھائی کتنے خوش نصیب تھے۔ اس لحاظ سے بھی کہ خدا نے ان کو ایک ذہن رسا ہی نہیں دیا تھا بلکہ خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہنے کا بے پناہ حوصلہ اور ہمت بھی دی تھی۔ اپنے خط میں الطاف فاطمہ کہتی ہیں:

> تم نے قطرہ قطرہ کر کے ادب و علم اور ایک شخص کی یادوں کا ایک سمندر جمع کر لیا ہے۔ بہاولپور کی علمی، ادبی اور شعری تحریکات کا جب بھی ذکر آئے گا یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک دقیع حوالہ ثابت ہوگا۔ سب سے بڑی بات جو بھائی ہے۔ اس کی وہ اس میں مشمولہ تمام مضامین کا دھیما، پُر سوز اور ٹھہرا ہوا لہجہ اور انداز ہے اور اس پورے رسالے کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے گویا شہاب بھائی کی خاموش بردبار اور حکیم شخصیت اور روح اس کے اندر کارفرما ہے۔ [۲۱]

الطاف فاطمہ الزبیــــر کی تمام تحریروں پر تبصرہ کرتی تھی اور دل کھول کر تعریف کرتی تھیں۔ ان کے تمام خطوط پڑھ کر علم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ الزبیر کے سفر نامے کا طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے جواب نہ لکھ پائی مگر بعد میں اس پر تبصرہ کیا۔ الطاف فاطمہ کہتی ہیں:

> تمہارا کام اور ادب کا شعبہ سیر وسیاحت کی خدمت کسی بھی تعریف سے بالاتر ہے۔ اپنے کاموں اور مصروفیتوں کے باوجود اتنا دقیع اور کیم ضخیم شمارہ نکالنا، درحقیقت بڑی ہمت اور جذبہ شوق کے تحت ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ شمارہ صرف ضخیم ہی نہیں بلکہ اس کے مشمولات تحقیق و تنقید کی ایک دقیع دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ [۲۲]

الطاف فاطمہ کو اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا۔ وہ اخبار بہت کم پڑھتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں اخبار پڑھنے سے سیاسی غور بہت بڑھ جاتا ہے اور سیاسی شعور بڑھ جانے کی وجہ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے مگر افسانہ یا ناول لکھنے کی طرف طبیعت نہیں آتی۔ وہ کہتی ہیں:

> ایک زمانے میں میرا بھانجا روزانہ اخبار پڑھوا تا تھا۔ بس پھر میں سیاسی بحثیں کرتی تھیں۔ افسانہ نہیں لکھتی تھیں پھر میں نے دو ڈھائی سال تک اخبار بالکل نہیں پڑھا اور خوب افسانے لکھے۔ [۲۳]

الطاف فاطمہ کا گھریلو ماحول ہی ایسا تھا کہ سب خواتین شوق سے مطالعہ کرتی تھیں۔ علمی وادبی ماحول تھا۔ اپنے پہلے افسانے کے حوالے سے الطاف فاطمہ کہتی ہیں کہ میں نے پہلا افسانہ اس وقت لکھا۔ جب میں اورینٹل کالج سے ایم۔اے کر رہی تھی۔ انھوں نے فکشن ہی ایم۔اے میں جا کر پڑھنا شروع کیا۔ انھیں یاد ہیں کہ ان کے پہلے افسانے کا عنوان کیا تھا۔ وہ افسانہ لاہور سے نکلنے والے ایک پندرہ روزہ رسالہ بنت راوی میں شائع ہوا تھا۔

بڑھاپے میں جب الطاف فاطمہ کی دونوں آنکھیں بینائی سے محروم ہو گئیں تو ڈاکٹر حمیرا ارشاد اپنی طالب علم

امرینہ بابر کے ساتھ الطاف فاطمہ کے گھر گئیں کیونکہ ان کے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے امرینہ بابر ان کے گھر گئیں تاکہ ان کے خطوط اور کچھ تحریریں انھیں پڑھ کر سنائیں۔ امرینہ بابر کہتی ہیں:

> الطاف فاطمہ اردو ادب کی نامور ادیب، کڑک، ٹھسے دار اور بہت بااصول خاتون تھیں۔ میں نے انھیں صرف ایک ادیب اور لکھاری ہی کے روپ میں نہیں دیکھا بلکہ ہر رنگ میں بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ میری ان سے لگ بھگ گیارہ برس زندگی کا وہ وقت ہے جسے صحیح معنوں میں زندگی کہتی ہوں۔ انھی گیارہ سالوں میں، میں نے حیات بے اعتبار کو پرکھنا اور برتنا سیکھا۔ آگہی، شعور اور سلیقہ کے معانی پہچانے۔ [۱۵]

۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر حمیرا ارشاد (صدر شعبۂ اردو، لاہور کالج) ڈاکٹر امرینہ بابر کو کنج گلی لے کر گئیں تاکہ وہ انھیں روز کی ڈاک، نئے رسائل اور کتب پڑھ کر سنائے۔ ڈاکٹر امرینہ بابر نے الطاف فاطمہ کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بہت بارعب اور سخت مزاج کی بڑی اردو دان خاتون ہیں۔ اگر روانی میں کوئی لفظ غلط ادا ہو جائے تو محترمہ خوب کلاس لیتی ہیں لیکن ان کے درمیان نانی استاد کا رشتہ قائم ہو گیا۔

الطاف فاطمہ کا حلیہ امرینہ بابر کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہیں:

> سادہ مگر بہت پُرسکون در و دیوار کی اس باوقار مکین کا وہ برسوں پرانا سراپا آج بھی میری نظروں میں زندہ ہے۔ الطاف فاطمہ تیزی سے بڑھاپے کی طرف بڑھتی ایک دھان پان مگر باحوصلہ خاتون تھیں۔ سر پر سفید دودھیا بال جنھیں بڑے سلیقے سے ایک چوٹی میں باندھ رکھا تھا۔ گندمی رنگت کشادہ پیشانی اور جھریوں سے بھرا چہرہ۔ اس چہرے پر دو بے نور آنکھیں ایک تو بالکل بند تھی دوسری کی پلک میں جنبش ضرور ہوتی مگر دیکھنے سے وہ بھی قاصر تھی۔ لمبی لمبی ناک بڑے نتھنے جو ان کی تیز قوت شامہ کا پتہ دیتے تھے۔ پتلے پتلے دو گلابی ہونٹ جو زیادہ تر ایک دوسرے میں پیوست رہتے۔ اس متین چہرے پر سب سے نمایاں ان کے دو بڑے بڑے کان تھے۔ قد و قامت بہت واجبی اور ہاتھ پیر بہت ننھے منے۔ ہاتھوں کی بناوٹ اور نرمی سے سلیقہ اور نفاست جھانکتی تھی۔ ان کی انگلیاں واقعتاً ایک لکھاری کی انگلیاں لگتیں۔ ڈھیلا ڈھالا کرتہ شلوار اور اس پر بڑا نفیس استری کیا کاٹن کا سفید دوپٹہ ایک عجیب سا تقدس ان کی ذات سے چھلک رہا تھا۔ جبکہ عمر کے آخری پہر الطاف فاطمہ بہت کمزور اور ضعیف ہو گئی تھیں۔ [۱۶]

ڈاکٹر امرینہ بابر اور الطاف فاطمہ کے درمیان آہستہ آہستہ رشتہ پیدا ہونے لگا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنے لگیں۔ پھر وہ انھیں ٹھنڈی چھاؤں جیسی ہستی ماں لگنے لگی۔ الطاف فاطمہ کے کہنے پر یہ ان کے گھر شفٹ ہو گئیں۔

الطاف فاطمہ کے بھانجے کبیر عمر نے زبردستی ان کی آنکھ کا آپریشن کروا دیا۔ یوں ان کی آنکھ کی روشنی لوٹ آئی۔ یوں ان کے لکھنے پڑھنے کا کام بحال ہو گیا۔

الطاف فاطمہ نے اکیلے ہی زندگی کا سفر نہایت کامیابی سے گزارا۔ ان کی شخصیت میں ان کے مزاج میں، ان کے رہن سہن اور خاندانی پس منظر کا عمل دکھائی دیتا تھا۔ دورانِ گفتگو سخت مزاج معلوم ہوتی تھیں لیکن وہ نہایت مہذب، شفیق اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہیں۔ حقیقت پسند تھیں، لگی لپٹی بات نہیں کرتی، تصنع سے پاک رہتیں۔ گھر میں سجاوٹ کے لیے اصلی پھول پسند کرتی تھیں، تنہا رہتی تھیں مگر گھر میں ہمیشہ دس لوگوں کا کھانا پکتا تھا، مہربان تھیں۔ کسی کو دکھ نہیں دے سکتی۔ لہجہ سخت لیکن دل نرم، دکھاوا پسند نہیں کرتیں بلکہ دکھاوے سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ ہر قسم کی نمود و نمائش سے بے نیاز تھیں۔ شہرت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اعضاء و اعصاب کی کمزوری اور خراب ملکی سیاسی و سماجی حالات نے ان کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔

الطاف فاطمہ کی شخصیت کے ہر پہلو کو سمجھنا مشکل ہے لیکن الطاف فاطمہ کے فن اور شخصیت کو سمجھنے کے لیے انتظار حسین کی یہ تحریر بہت اہم ہے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> الطاف فاطمہ افسانے لکھتی ہیں۔ کالج میں پڑھاتی ہیں اور لازنس روڈ پر رہتی ہیں۔ یہ عمل ایک عرصے سے جاری ہے۔ اس میں اگر حال میں تبدیلی آئی ہے تو اتنی کہ لازنس روڈ کے ایک مکان سے اٹھ کر اسی سڑک پر دوسرے مکان میں چلی گئی ہیں۔ مگر یہ بھی کوئی ایسی تبدیلی نہیں جیسا وہ مکان تھا۔ ویسا ہی یہ مکان ہے۔ گھر میں صدر دروازہ وہاں بھی نہیں تھا۔ یہاں بھی نہیں ہے۔ سڑک سے مڑو تھوڑی دور چلو یکایک احساس ہو گا کہ ہم ایک گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ الطاف فاطمہ صدر دروازے کی قائل ہی نہیں ہیں۔ بس یہی الطاف فاطمہ کی شخصیت ہے۔ ادیب اتنے سیدھے سادے کہاں ہوتے ہیں اور اگر لکھنے والی خاتون ہو تو پھر مزید پیچ پڑ جاتے ہیں۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت دوسروں سے الگ نظر آئے۔ بس اسی فکر میں اپنے اوپر پہرے بٹھا لیے جاتے ہیں۔ اتنے کہ شخصیت میں داخل ہونے کے لیے دروازہ ہی نہیں ملتا، دروازہ مل جائے تو شخصیت نہیں ملتی مگر یہاں دروازہ ہے ہی نہیں۔ شخصیت جیسی ہے، سامنے نظر آتی ہے۔ چہرے مہرے سے چال ڈھال سے، سج دھج سے، کسی الگ قسم کی شخصیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ملو اور باتیں کرو تو لگتا ہے کہ کسی گھریلو قسم کی روایتی خاتون سے ملاقات کر رہے ہیں۔ افسانہ پڑھو تو حیرانی ہوتی ہے کہ اچھا یہ افسانہ اس خاتون کا لکھا ہوا ہے۔[۱۷]

الطاف فاطمہ تنہا رہتی تھیں۔ انھوں نے شادی نہیں کی، تنہا مگر باوقار زندگی گزاری۔ ان کا گھر ان کے مہذب ہونے اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کا مظہر ہے۔ ایک پرانا ملازم غلام حسین جو سچا نمک خوار دکھائی دیتا تھا اور ایک بچی ساتھ رہتی تھی۔ جس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ انھوں نے لے رکھا تھا۔ شادی نہ کرنے کی وجہ الطاف فاطمہ نے خود کبھی نہیں بتائی لیکن ان کے بھائی فضل قدیر کے نزدیک ان کی شادی نہ کرنے کی وجہ یہ تھی:

طبیعت میں انانیت اور حکم رانی کا عنصر بہت زیادہ تھا جس کی بنا پر انھوں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ مردوں کی برتری بھی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔[۱۸]

الطاف فاطمہ نے بہت سے ناول لکھے اور افسانوں کے ساتھ مختلف کتابوں کے تراجم بھی کیے لیکن انھیں وہ پذیرائی نہ مل سکی۔ جن کی وہ اصل حق دار تھیں۔ اس بات کا احساس انھیں خود بھی تھا لیکن انھیں دنیاوی فوائد سے کوئی سروکار یا لالچ نہیں تھا۔ انھوں نے جنرل ضیاء الحق کے ہاتھ سے ملنے والے تمغہ حسن کارکردگی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اخبارات اور ٹیلی ویژن کے لیے انٹرویو دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد شہرت حاصل کرنا نہیں صرف لکھنا تھا۔ انھیں بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کی امی بتاتی تھیں کہ پہلے جب بازار سے سودا کاغذ کے لفافوں میں آتا تھا تو ان کا حکم تھا کہ ان لفافوں کو پھینکا نہ جائے۔ ملازم لفافے خالی کر کے ان کو دے دیتا اور وہ لفافوں پر لکھی تحریر بھی بڑی توجہ سے پڑھتیں۔

الطاف فاطمہ کبھی کسی تنظیم یا نظریاتی ادارے سے وابستہ نہیں ہوئیں۔ ان کا اپنا ایک منفرد انداز تھا مگر وہ خواتین کی ترقی اور حقوق کی علم بردار تھیں۔ اس لیے ان کے افسانوں اور ناولوں کے کرداروں میں ایسی لڑکیاں نظر آتی ہیں جو فرسودہ روایات سے بغاوت کرتی ہیں۔ الطاف فاطمہ کی بھانجی نے ان کی پذیرائی نہ ملنے پر کہا کہ پاکستان کے نام نہاد ٹھیکے داروں نے الطاف فاطمہ کی قدر نہیں کی مگر مجھے یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں ان کے کام کو پذیرائی ملے گی جس کی صحیح معنوں میں وہ مستحق تھیں۔

الطاف فاطمہ قراۃ العین سے متاثر تھیں اور کہتی تھیں کہ اس کا کوئی مدّ مقابل نہیں ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق سے اس وقت تک وابستہ رہیں۔ جب تک کہ تنظیم سیاسی دباؤ، تصریف اور گروہ بندی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ بعد ازاں عملی طور پر انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کیونکہ ان کا جو منشور تھا وہ ہی بدل گیا تھا۔

> جب میں پڑھتی تھی تب سے حلقہ اربابِ ذوق میں بیٹھتی تھی۔ لیکن پھر میں وہی کہوں گی کہ سیاسی باتیں بہت ہو گئی تھیں۔ اس کے اوپر بول رہے ہیں، علم نصب کیے جا رہے ہیں۔ گالیاں سُن رہے ہیں۔ پھر میں نے جانا چھوڑ تھا۔ اس کا جو منشور تھا وہی بدل گیا تھا۔[۱۹]

الطاف فاطمہ کے نزدیک عورت فطرتاً باریک بین ہوتی ہے۔ بال کی کھال بہت نکالتی ہے اس لیے انسانی رشتوں کی پیچیدگیاں اس کی نظر میں رہتی ہیں۔ پھر اس میں ایک حِس ایسی ہوتی ہے کہ وہ آنے والے واقعات کو بھانپ لیتی ہے۔

تصانیف:

الطاف فاطمہ جب اورینٹل کالج سے ایم۔اے کر رہی تھیں تو پہلا افسانہ پھر اس رہ گزر کی باتیں کریں گے عنوان سے لکھا۔اس کے بعد باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کر دیئے۔روزنامہ "امروز" میں بھی ان کا افسانہ چھپا۔انھوں نے نہ صرف ناول لکھے بلکہ افسانوں کے ساتھ ساتھ مختلف تراجم بھی کیے۔معاشرتی مسائل کو اپنی تحریروں میں بیان کیا۔

ناول:

الطاف فاطمہ کی اصل شہرت ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے۔ان کے ناول درج ذیل ہیں۔

ان کا پہلا ناول نشانِ محفل جو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دانیال لاہور سے شائع ہوا۔اس کے بعد ان کا دوسرا ناول دستک نہ دو پہلے ناول کے چھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں فیروز سنز لاہور سے شائع ہوا۔تیسرا ناول چلتا مسافر ۱۹۸۱ء میں فیروز سنز، لاہور سے شائع ہوا اور ان کا آخری ناول خواب گر ۲۰۰۵ء میں فیروز سنز، لاہور سے شائع ہوا۔

نشان محفل ایک المیہ رومانی ناول ہے۔کافی ضخیم ناول ہے جو سات سو صفحات پر محیط ہے۔اس ناول میں انھوں نے مغرب و مشرق کی عورت کے فرق پر روشنی ڈالی ہے۔دستک نہ دو ناول بھی المیہ کی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔اس ناول میں وہ نسوانی نفسیات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔حقیقت نگاری کے ہر معیار پر یہ ناول پورا اترتا ہے۔ دستک نہ دو کا انگلش ترجمہ *The one who did not ask* کے نام سے Heinemann (۱۹۹۳ء) سے کیا۔

افسانوی مجموعے:

افسانہ نگار کی حیثیت سے الطاف فاطمہ بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔طالب علمی کے زمانے میں ہی ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔روایتی انداز سے ہٹ کر افسانے لکھے۔معاشرتی مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا اور اپنی تحریروں میں معاشرتی مسائل کو بیان کیا۔معاشرے کی قدیم روایات کو پسند کرتی تھیں۔الطاف فاطمہ کے افسانوی مجموعے درج ذیل ہیں۔

الطاف فاطمہ کا پہلا افسانوی مجموعہ وہ جسے چاہا گیا ہے، ہے۔پہلی مرتبہ "اردو ڈائجسٹ" میں شائع ہوا۔اس میں ۱۴ افسانے شامل ہیں۔یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں فیروز سنز، لاہور سے شائع ہوا اور دوسری مرتبہ جنوری ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

الطاف فاطمہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، ہے۔ اس میں ۱۰ افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں قصور آرٹ پریس، لاہور سے شائع ہوا اور دوسری مرتبہ ۲۰۰۳ء میں دی سمیع سنز پرنٹرز کراچی سے اشاعت ہوئی۔

الطاف فاطمہ کا تیسرا افسانوی مجموعہ تارِ عنکبوت ہے۔ یہ ۱۴ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۹۰ء میں فیروز سنز، لاہور سے شائع ہوا ہے۔

الطاف فاطمہ کا چوتھا افسانوی مجموعہ گواہی آخر شب کی ہے۔ یہ ۴۲ افسانوں پر مشتمل کتاب ہے۔ ۲۰۱۸ء میں جمہوری پبلی کیشنز، لاہور سے اشاعت ہوئی۔

الطاف فاطمہ کی وفات سے قبل ان کا ایک افسانوی مجموعہ دیدو ادید شائع ہوا۔ الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں وکیل انجم کہتے ہیں کہ:

> افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی الطاف فاطمہ کا نام بہت اونچا ہے بلکہ ان کی پہچان افسانہ نگار کی حیثیت سے بنی۔ افسانوں میں انھوں نے روایت کو ترک کرتے ہوئے نئے موضوعات کو چھیڑا ہے۔ محبت کا ذکر ان کے افسانوں میں کثرت سے ملتا ہے مگر محبت ان کے افسانوں میں مختلف رنگ و روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔[۲۰]

تراجم:

الطاف فاطمہ کی تصانیف میں ناول اور افسانوں کے علاوہ تراجم بھی شامل ہیں۔ *To Kill a Mocking bird* کا اردو ترجمہ نغمے کا قتل (ہاریرلی) کے عنوان سے کیا۔ *My Children, My Gold* کا اردو ترجمہ میرے بچے میری دولت کے عنوان سے کیا۔ *The Pearl* by John Stenbek کا اردو ترجمہ موتی کے عنوان سے کیا۔ *Truth Tales* کا ترجمہ سچ کہانیاں کے عنوان اور *Santa Claus in Baghdad* by Elsa Marston کا اردو ترجمہ زیتون کے جھنڈ اور *Collection of Japanies Short stories* کا اردو ترجمہ جاپانی افسانہ نگار خواتین اور *Inside Haveli* by Rame Mehta کا اردو ترجمہ حویلی کے اندر عنوان سے کیا۔

اس کے علاوہ ان کے تراجم میں بڑے آدمی اور ان کے نظریات (سال کے پیڈوور)، سکھی شہزادہ (آسکر وائلڈ)، ایک تھا لڑکا، مائی لارڈ حقہ، بڑی بی کا بچھڑا، رات کا کھیل شامل ہیں۔

ڈرامہ:

انھوں نے ریڈیو کے لیے بھی کئی ڈرامے لکھے جس میں "کہکشاں کی دھول"، "دھنک پر قدم" اور "پختہ دیوار" شامل ہیں۔ "کہکشاں کی دھول" ریڈیو پاکستان سے نشر بھی ہوا۔ ان کے ناول "دستک نہ دو" کو بھی ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

تنقید:

الطاف فاطمہ نے اپنے ایم۔اے کے تحقیقی مقالے کو اردو ادب میں فن سوانح نگاری کی ابتدا کے عنوان سے کتابی شکل دی۔ یہ تنقیدی کتاب ہے جس میں سوانح نگاری کو بیان کیا گیا ہے۔

جنرل:

الطاف فاطمہ نے ناول، افسانوں، ڈراموں اور تنقید کی کتاب کے علاوہ ایک کتاب روزمرہ آداب بھی لکھی ہے جو کہ ۱۹۶۳ء میں مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں روزمرہ زندگی گزارنے کے مختلف آداب تحریر کیے ہیں۔

وفات:

الطاف فاطمہ کافی عرصے سے لاہور میں مقیم تھیں اور طویل عرصے سے علیل تھیں۔ آنکھوں کی بینائی بھی چلی گئی لیکن ان کے بھانجے نے ان کی آنکھوں کا آپریشن بھی کروایا جس سے ان کی بینائی واپس آگئی۔ نشاط فاطمہ کے بیٹے عمر کبیر نے اپنی خالہ کا بہت خیال رکھا مگر علالت کی وجہ سے ایک صبح الطاف فاطمہ ہم سے بچھڑ گئیں۔ ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کو ۹۱ سال کی عمر میں لاہور میں وفات پا گئیں۔

دورانِ تحقیق جب میری الطاف فاطمہ کی بھانجی سے وفات کے متعلق بات ہوئی تو وہ کہتی ہیں کہ ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کی صبح وہ کیسے بھول سکتی ہیں جب عامر نے انھیں بتایا کہ شمو خالہ چلی گئی۔ شمو خالہ اردو ادب کی الطاف فاطمہ۔۔۔۔ انھوں نے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے الطاف فاطمہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہم بھی کیسے لوگ ہیں۔ زندوں کی قدر نہیں کرتے اور جب کوئی دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہاتھ ملتے ہیں سر پیٹتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ الطاف فاطمہ کو جیتے جی وہ قدر نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں۔ لیکن یقین ہے کہ آنے والے وقتوں میں ان کے کام کو وہ پذیرائی ملے گی جس کی صحیح معنوں میں وہ مستحق ہیں۔ سنڈے میگزین جنگ میں الطاف فاطمہ کی وفات کے بارے میں کہا گیا کہ:

فہمیدہ ریاض کی وفات کے بعد یہ مشکل ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ایک اور نامور مصنفہ ہم سے بچھڑ گئیں۔
الطاف فاطمہ نے نوے سال کی عمر میں ۲۹ نومبر ۲۰۱۸ء کو وفات پائی۔[۲۱]

اس میگزین میں الطاف فاطمہ کے کام پر بھی بات کی گئی۔ الطاف فاطمہ کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ ۲۰۱۸ء جاتے جاتے اردو ادب کی دو اہم اور منفرد خواتین ادیبوں کو ساتھ لے گیا۔ الطاف فاطمہ اردو کی اہم افسانہ و ناول نگار اور مترجم تھیں۔ الطاف فاطمہ کا ایک اپنا ہی منفرد اسلوب اور کرشمہ تھا جو ان کے کرداروں میں جھلکتا تھا۔ خاص طور پر ان کے نسوانی کرداروں میں۔ کنور رحمان خان نے الطاف فاطمہ کی وفات کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

> دستک نہ دو کی مصنفہ الطاف فاطمہ چل بسیں۔۔۔۔۔اردو کی معروف ناول نگار، ادیبہ اور افسانہ نویس الطاف فاطمہ ۹۱ برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔۔۔الطاف فاطمہ لاہور میں مقیم تھیں اور طویل عرصے سے علیل تھیں۔
>
> وہ ھارتی ریاست اترپردیش کے دارالحکومت لکھنو میں ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد ان کا خاندان لاہور آکر آباد ہو گیا تھا۔ لکھنؤ کی تہذیبی روایات کا اثر الطاف فاطمہ کی شخصیت پر نمایاں تھا۔[۲۲]

الطاف فاطمہ کے انتقال کو ملک کے ادبی حلقوں نے ایک بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔ ممتاز شاعر اور ادیب امجد اسلام امجد نے الطاف فاطمہ کی وفات پر وائس آف امریکہ سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ناولوں نے ناول نگاری کی جہت پیدا کی تھی۔ اور ان کا ناول دستک نہ دو اپنی اشاعت کے وقت اتنا مقبول ہوا تھا کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے اسے ڈرامائی شکل دی تھی۔

الطاف فاطمہ کی وفات پر معروف قانون دان اور علامہ اقبال کی بہو جسٹس ریٹائرڈ ناصرہ جاوید اقبال بھی غم زدہ ہیں۔ وائس آف امریکہ سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ الطاف فاطمہ کی ادبی خدمات ایک لمبے عرصے تک یاد رکھی جائیں گی۔ ناصرہ جاوید نے کہا کہ انھیں کتابیں پڑھنے خاص طور پر ناول پڑھنے کا شوق الطاف فاطمہ کے ناول سے ہی ہوا تھا۔

الطاف فاطمہ کی وفات پر ڈاکٹر نگہت نسیم نے ان سے اپنی بات چیت کے متعلق بیان کیا اور کہا کہ جولائی ۲۰۱۷ء میں مجھے الطاف فاطمہ سے بات کر کے دھچکا لگا۔ انھوں نے بہت محبت اور شفقت سے ان تک پہنچنے کا شکر ادا کیا۔ اور بتایا کہ انھیں فون پر صحیح سنائی نہیں دیتا اور اپنے گھر لاہور آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر نگہت نسیم عالمی اخبار میں الطاف فاطمہ کی وفات کے بارے میں کہتی ہیں کہ:

> الطاف فاطمہ جنھیں اہلِ ادب کی اکثریت زندگی میں ہی بھول گئی۔ کل وہی دن تھا جب محترمہ الطاف

فاطمہ کی وفات کی خبر ملی۔۔۔ سارے زخم پھر سے ہرے ہوگئے۔۔۔ کیا کیا نہ یاد آیا۔۔۔ ان کی وہ دھیمی دھیمی آواز اور مخصوص مشفقانہ استادوں والا لہجہ ذہن میں ان کی محبت سے بھرپور صورت بناتا گیا۔ مجھے ذاتی طور پر کبھی بھی یوں نہیں لگا کہ میں الطاف فاطمہ سے بالمشافہ نہیں ملی ہوں اور میرے نزدیک کسی کامیاب ترین تخلیقار کا معیار یہی ہے کہ آپ اسے روزان کی تحریروں میں ملیں۔۔۔ الطاف فاطمہ نے ایک طویل افسانے کا ذکر کیا تھا۔ نہیں جانتی کہ وہ اسے مکمل کر پائیں یا وہ افسانہ ادھورا ہی رہ گیا۔ ظاہری طور پر تو الطاف فاطمہ کا سفر مکمل ہو گیا۔ لیکن یہ معاشرہ اور اردو کی ادبی دنیا شاہد ان کے تخلیقی کام کا قرض کبھی نہ اتار سکے۔ [۲۳]

اردو ادب کے بڑے نقادوں میں شامل سیّد وقار عظیم نے الطاف فاطمہ کے افسانوی مجموعے وہ جسے چاہا گیا کے مقدمے میں ان کے فن کو الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ایک محبت سے صدہا انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے اور ایک غم کی کوکھ سے ہزاروں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ فرق صرف اس نظر کا ہے جس سے محبت اور غم کا ایک انوکھا روپ سامنے آتا ہے اور فرق اس دل کا ہے جو برسنے میں نئے انداز سے دھڑکتا ہے اور پھر اس دماغ کا جس کی اپنی سوچ ہے۔ دماغ کے اس فرق سے ہزاروں فلسفے بنتے ہیں لیکن فلسفے بنتے صرف اس صورت میں ہیں کہ انسان اپنی نظر سے دیکھے۔ اپنے دل سے محسوس کرے اور اپنے دماغ سے سوچے۔ نظر کے جلوے، دل کی دھڑکنیں اور دماغ کی الجھنیں ان سب میں ہماری ذات کا عکس اور نقش ہے۔

ذات کی انفرادیت جتنی واضح اور جتنی گہری ہو گی جلوؤں کی رعنائی دھڑکنوں کے آہنگ اور الجھنوں کے پیچ و خم میں اثر انگیزی اور دل نشینی کا وصف اتنا ہی نمایاں ہو گا۔ یہ وصف الطاف فاطمہ کی کہانیوں میں قابلِ رشک حد تک موجود ہے۔ یہ وصف بغیر کسی دعوے، نمائش اور نام و نمود کی خواہش کے دوسروں کے دکھوں سے آگاہ ہونے اور ان دکھوں کو اپنا بنا لینے کا وصف ہے۔ [۲۴]

مجموعی طور پر الطاف فاطمہ اردو ادب کی مشہور و معروف ناول نگار، ادیبہ، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور مترجم تھیں۔ ساٹھ کی دہائی میں سامنے آئیں، تقسیمِ ہند کے حالات کو دیکھا اور اپنی تحریروں میں بیان کیا۔ وطن پرست تھیں اس لیے ان کی تحریروں میں وطن سے محبت اور مغربیت کا رنگ واضح نظر آتا ہے۔ ایک ایسی نثر نگار جس نے نصف صدی سے زیادہ اور نوے سال کی عمر تک کوچہ ادب میں گزارے لیکن انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کی یہ حق دار تھیں۔

حوالہ جات

۱۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر و فن کا جائزہ(مقالہ برائے ایم۔اے، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی)، ص ۱۰۔

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۴۔ فوزیہ عنصر، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری(مقالہ برائے ایم۔اے، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۔

۵۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر وفن کا جائزہ۔ص ۱۳۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۷۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۹۔ فوزیہ عنصر، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری ۔ص ۵۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۔

۱۱۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر و فن کا جائزہ، ص ۱۵۔

۱۲۔ الطاف فاطمہ، "شہاب صاحب کے خاندانی پس منظر کی ایک جھلک" مشمولہ الزبیر۔(بہاول پور: پنجاب یونیورسٹی)، ص ۸۲۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔

۱۴۔ فوزیہ عنصر، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری۔ص ۵۔

۱۵۔ http://www.facebook.com/550483888344619/posts/2201306503262342/?appfbl، تاریخ ملاحظہ ۲۴ مارچ ۲۰۲۰ء۔

۱۶۔ ایضاً، تاریخ ملاحظہ ۲۳ مارچ ۲۰۲۰ء۔

۱۷۔ فوزیہ عنصر، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، ص ۷۔

۱۸۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر و فن کا جائزہ، ص ۱۷۔

۱۹۔ فوزیہ عنصر، الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری، ص۸۔
۲۰۔ تسنیم آصف، الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر و فن کاجائزہ، ص۲۱۔
۲۱۔ ناظر محمود، الطاف فاطمہ کا فکشن، روزنامہ جنگ (اسلام آباد: ۳فروری ۲۰۱۹ء)۔
۲۲۔ www.urduvoa.com.art.pk، تاریخ ملاحظہ ۲۵مارچ ۲۰۲۰ء، بوقت ۳:۱۵ pm
۲۳۔ نگہت نسیم۔الطاف فاطمہ جنھیں اہلِ ادب کی اکثریت ان کی زندگی میں ہی بھول گئی۔عالمی اخبار (اسلام آباد: ۳۰نومبر ۲۰۱۸ء)۔
۲۴۔ http://www.facebook.com/5504838883446191/posts/3460848317308147/?app=fbl، تاریخ ملاحظہ ۲۵مارچ ۲۰۲۰ء۔

باب سوم:

ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں

باب سوم:

ناسٹلجیا: واقعات کے تناظر میں

ناسٹلجیا سے مراد ماضی پسندی ہے۔ یہ ایسی بیماری یا کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کو اپنا گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ انسان حال سے زیادہ ماضی کو پسند کرتا ہے۔ حال کی باتیں بھول کر ماضی کی باتیں یاد کرنے لگتا ہے۔ حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ حساس فرد ہمیشہ حال سے زیادہ ماضی کو پسند کرتا ہے۔ الطاف فاطمہ بھی عہدِ حاضر کی نہایت حساس افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تصانیف میں ان کے مخصوص عہد اور ماحول کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد پروان چڑھنے والی نسل کے ذہنی و فکری رویوں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ماضی ایک توانا حوالہ بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ماضی زندہ و جاوید نظر آتا ہے۔ غلام حسین اظہر اس بارے میں کہتے ہیں کہ :

> الطاف فاطمہ نے حال کے ہنگامے اور آشوب سے جلتی ہوئی روحوں کی حسرتوں اور مایوسیوں کے زخموں کو فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے جنھیں وقت کی لہر لہر مندمل کرنے کی بجائے اور زیادہ گہرا کر دیتی ہے۔ الطاف فاطمہ نے مایوسیوں اور افسردگیوں، امیدوں اور آرزوؤں کی ایسی فضا تخلیق کی ہے جس سے ابھرنے والی لہریں دورِ جدید کے جوار بھاٹا کی پیدا کردہ ہیں۔ لیکن جس ساحل سے وہ ٹکرا رہی ہیں وہ ساحل مشرقی دل ہے جو محبت، انسانی رشتوں کے تقدس اور احترام سے عبارت ہے۔[1]

الطاف فاطمہ کی تحریروں میں ماضی کا انسان مربوط شناخت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس انسان کا رشتہ گزرے ہوئے کل سے زیادہ مضبوطی سے جڑا ہوا تھا۔ وہ ایک تسلسل سے زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن وقت کے بدلتے تناظر نے اس کی زندگی سے اس تسلسل کو مٹا دیا ہے۔ اس لیے وہ گذشتہ کل سے ہر گزرتے پل کے ساتھ دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہی عدم تسلسل اس کی شناخت کی گمشدگی کی علامت ہے یہی دکھ اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ شناخت کے گم ہو جانے کے المیے کو الطاف فاطمہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اور اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی کی روایات سے ایک خاص قسم کی انسیت کا تاثر ابھرتا ہے جبکہ موجودہ زمانے کی سماجی اقدار اور ان سے وابستہ رویوں میں شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں حال کے کسی واقعے سے فرد ماضی کے کسی خاص واقعات میں کھو جاتا ہے۔ وقت کی

تبدیلی کا احساس موجود ہے۔ وقت کی ناپائیداری کا شدید احساس ملتا ہے۔ انسان صدیوں کی مسافت طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اپنے دور، ساتھی اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے خوبصورت لمحات کو یاد کر کے بیک وقت خوش اور اداس ہو جاتا ہے۔ بچھڑنے کی اذیت، درد کو محسوس کرتا ہے۔ یہ سب یادیں اسے اداسی اور تنہائی کا احساس دلاتی ہیں۔ بقول عذرا لیاقت:

> ان کے بیشتر افسانوں میں لمحہ حال سے ماضی کی طرف لوٹنے کا رجحان ملتا ہے۔ ان کے بہت سے کردار ماضی کی یاد میں محو ہیں۔ حال کی تلخی اور ہر لمحہ رنگ و اقدار بدلتی دنیا میں گزرتے وقت نے جس طرح دیمک کی طرح انسانیت، خلوص، محبت اور ہمدردی کو چاٹا ہے۔ اس نے ہر شخص کو دکھ اور اضمحلال کا شکار کر دیا ہے۔ اب وہ دکھی اور مغموم شخص دکھ سے گھبرا کر ماضی کی حسین یادوں میں پناہ محسوس کرتا ہے۔[۲]

الطاف فاطمہ کو ماضی کی ہر شے سے رغبت تھی۔ ماضی کے ادوار، علاقوں اور اشیاء سے خاص انسیت تھی۔ اپنے افسانوں میں حال کا ذکر کرتے ہوئے ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ کسی بھی واقعے کو بیان کرتے ہوئے ماضی کے واقعات کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے باطنی طور پر وقت کی تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور ان کا ذہن آج بھی ماضی اور حال کے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کی منظر کشی کرتے ہوئے قدیم ادوار کی رونقوں کو اس طرح سمیٹتی ہیں کہ ماضی کا ایک پورا دور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں موجود ہے۔ حال کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ماضی کے واقعات کی طرف مراجعت کر جاتی ہے۔ حال کے واقعے کو یکسر فراموش کر کے پورا افسانہ ماضی کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ الطاف فاطمہ کا افسانہ **جشنِ دارد** میں علاقے کا ٹربائن پھٹ جانے سے وہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔ ماضی اور حال کا فرق بیان کرتی ہیں۔ افسانے کے آغاز میں الطاف فاطمہ لکھتی ہیں:

> علاقے کا ٹربائن پھٹ گیا تھا پہلے جیسے دن ہوتے تو یہ خبر آناً فاناً پھیلتی اور ہم تک آ جاتی۔۔۔۔۔۔[۳]

علاقے کا ٹربائن پھٹ گیا تھا۔ اگر پہلے کی طرح ہوتا تو محلے کے بچے جوان بوڑھے سب اس خبر کو جلدی جلدی پھیلا دیتے۔ اس واقعے سے الطاف فاطمہ ماضی کی طرف مراجعت کرتی ہیں۔ پھر پورا افسانہ ماضی کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ پہلے لوگوں میں رابطہ بہت زیادہ تھا۔ خبر سفر کرتی تھی۔ اب انسانی رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ بہت عرصے بعد چھت پر جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں تو سب تبدیل ہو گیا ہے۔

> اور اب جب کہ میں چھت پر پڑی کرسی پر بیٹھ کر گلی کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کہ

جہاں پہلے ایک کچی آبادی بنام جھگیاں ہوتی تھیں اور جہاں اب دو منزلہ خوب صورت اور خوشنما مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔[۴]

چھت پر خوب صورت دو منزلہ مکان کو دیکھ، ماضی کی کچی آبادی میں جھگیاں یاد آجاتی ہیں۔ اس سے گلی کی افسردگی اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ دیواریں اونچی ہونے سے لوگ ایک دوسرے سے دور چلے گئے ہیں۔ پہلے چھت سے تمام گھروں کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا لیکن اب ٹینکی راہ میں حائل تھی۔

اپنی بے تعلقی اور بے حسی کا سبب میں پانی کی اس ٹینکی کو ٹھہرا رہی تھی تو چند سال قبل یہاں موجود نہ تھی۔۔۔۔ اس کے باوجود اپنی بالکنی میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس گلی کے دم دم کی شریک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گلی بالکنی میں در آئی ہے اور بالکنی کے عین وسط میں جا بیٹھی ہے۔ اس وقت یہ گلی کتنی آباد تھی۔ کمیونی کیشن کتنا براہِ راست تھا۔[۵]

چھت پر ٹینکی دیکھنے سے ماضی کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ ایک علاقے کے ٹربائن کے پھٹ جانے سے اس ایک واقعے سے وہ ماضی کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔

اور تو اور اس گلی کے آخری سرے پر واقع کچی آبادی کی اقتصادی اور معاشی صورتحال کا اندازہ تک میں اس بالکنی میں کھڑے کھڑے لگا لیا کرتی تھی۔ فلاں کا کام اچھا چل رہا ہے۔ اب وہ نئی بائیسکل پر آتا جاتا ہے اور فلانے کا کام ان دنوں یوں ہی سا جا رہا ہے۔ چال میں تفکر اور استغراق نظر آتا ہے۔[۶]

الطاف فاطمہ ماضی کو سوچ کر دکھی اور اداس ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے رویے کا شعور جب انھیں ہوتا ہے۔ وقت کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اس دکھ سے دوچار ہو جاتی ہیں کہ وہ دوبارہ ماضی میں نہیں جا سکتی۔ اسی وجہ سے وہ ماضی میں پناہ لیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد عالم:

الطاف فاطمہ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو کر سکون محسوس کرتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت کی بے قدری سے نالاں ہیں اور ماضی میں ان کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہے جسے وہ رہ رہ کر یاد کرتی ہیں۔[۷]

ان کے افسانوں میں یادوں کا حسن اور ان سے تشکیل پانے والی انوکھی فضا موجود ہے۔ ان کے ہاں ماضی کے حسین خواب، پرانی یادیں اور ماضی کی رفاقتیں جھلکتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی اس خوب صورتی کو حسین اور دائمی دیکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے انسانوں، جذبوں میں محبت اور پیار کے خالص رنگوں کی متلاشی ہیں۔ یہی چیز ان کے افسانے جشنِ دار دمیں نظر آتی ہے۔ علاقے کے ٹربائن کے پھٹ جانے پر چھت پر جانے کے بعد وہ محسوس کرتی ہیں کہ آج کے دور میں چھتوں کی دیواریں بلند ہونے سے دوریاں بڑھ گئی ہیں۔ ان کے افسانوں میں روایتی محبت اور عشق و

عاشق کے قصے نہیں ملتے بلکہ وہ اپنے ارد گرد پھیلی زندگی کی حقیقتوں سے خوشی کشید کرتی اور ان سے محبت کے نئے مفاہیم سامنے لاتی ہے۔

جشنِ دارد مکمل افسانے میں درد کی کسک نظر آتی ہے۔ٹربائن کے پھٹ جانے سے الطاف فاطمہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔

> پہلے شام سویرے اپنے اپنے کاموں سے آنے جانے والے لوگ یہاں چلتے چلتے ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے، مصافحے کرتے، بیٹا بیٹی کی شادیوں اور سسرال میں ہونے والے جھگڑوں اور بدسلوکیوں کے بارے میں مشاورت کرتے۔[۸]

الطاف فاطمہ کے ہاں حال کے تہذیبی رویوں سے بغاوت اور ماضی کی تہذیبی اقدار سے محبت، انسیت اور لگاؤ کا احساس ملتا ہے۔ حال کے سماجی اقدار اور ان سے وابستہ رویوں میں شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور ماضی کی روایات سے خاص قسم کی انسیت کا تاثر ابھرتا ہے۔

> کیا بات تھی سبزی والے کی۔۔۔اس کا کمیونی کیشن تو بڑا اہم تھا اور وہ تو اس گلی کی گہما گہمی اور رابطوں کا مرکزی کردار تھا۔ دن کے دس گیارہ بجے وہ سائیکل کیریئر پر رنگ برنگی سبزیوں سے بھرا پرا سا ٹوکرا جمائے نمودار ہوتا تھا۔ چھٹی کا دن ہوتا تو میں بھی اس کے گاہکوں میں شریک ہو جاتی۔ اپنی ٹوکری کے ہینڈل میں رسی باندھ کر لٹکا دیتی اور وہیں جم کر بیٹھ کر اپنا رابطہ ان سب سے استوار کر لیتی۔[۹]

ماضی میں مل کر سبزی والے سے سبزی لینا، حال چال پوچھنا، افواہوں، اسکینڈلوں پر بحث کرنا، محلے کی پالیٹکس کو دیکھنا، تھیلے سنبھالے خواتین کو دیکھنا، شام کے وقت سب مزدوروں کا مل بیٹھنا۔۔۔۔۔ یہ سب ماضی کی حسین یادیں تھیں اور یہی واقعات الطاف فاطمہ کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ ترقی کی منازل طے کرتا انسان اپنے اقدار کو بھول بیٹھا ہے۔ انھیں دکھ ہوتا ہے کہ اب یہ آوازیں سرے سے سنائی ہی نہیں دیتی۔ ایک سناٹا سا محسوس ہوتا ہے۔ محلے کے بچے جوان جو بات کو خبر بننے سے پہلے ہی پورے محلے اور علاقے میں پھیلا دیتے تھے۔ اب نظر ہی نہیں آتے۔

> گرما کی تاروں بھری راتوں میں یہ گلی کتنی آباد ہو جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی گھٹن اور حبس سے گھبرا کر محلے کے لوگ باہر نکل آیا کرتے تھے۔ کیسی رونق اور گہما گہمی ہو جاتی۔ ہنسیاں، دل لگیاں، آپس کی چھیڑ چھاڑ، اسٹریٹ لیمپ تلے بیٹھ کر تاش کی، لوڈو کی بازیاں، یہ سب کتنا دلچسپ میورل تیار کرتا تھا۔[۱۰]

الطاف فاطمہ پرانی تہذیبی روایات کو اس طرح سے بیان کرتی ہیں کہ اس سے خود بخود محبت ہو جاتی ہے۔ دل

میں قدروں کی عزت بڑھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ان کے افسانوں میں جدید اور قدیم کے درمیان یہی نفسیاتی کشمکش بہت گہری ہو کر دکھائی دیتی ہے۔ الطاف فاطمہ کا فن یہ ہے کہ وہ ان گہرائیوں کے غم ناک پہلوؤں کو اثر انگیز طریقے سے ابھارتی ہیں۔۔۔ الطاف فاطمہ کا غم زندگی سے فرار نہیں کیونکہ اس میں ایک مخصوص قسم کا اخلاقی اثر موجود ہے۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ جدید راہ غلط ہے اس پر نہ جاؤ بلکہ وہ اس کے کانٹوں کا احساس دلاتی ہیں اور باقی پڑھنے والوں پر چھوڑ دیتی ہیں کہ اب وہ جو نتیجہ نکالے اور راستہ اختیار کر لے۔[11]

وقت کی تبدیلی کے ساتھ انسان ایک دوسرے سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ جشنے دار دمیں ناسٹلجیا موجود ہے۔ الطاف فاطمہ ایک واقعے کو دیکھ کر ماضی کے واقعات کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ ٹربائن کے پھٹ جانے کے بعد وہ ماضی کے واقعات میں کھو جاتی ہیں۔ حال اور ماضی کا فرق بیان کرتی ہیں۔ افسانے کے درمیان میں پھر وہی کیمونی کیشن شروع ہو جاتا ہے جو ماضی میں موجود تھا۔ لیکن اختتام پر دوبارہ ان کے ہاں دکھ اور کرب نظر آتا ہے کہ سب اپنے حال مُس گم ہو کر آج کی دنیا میں لوٹ جائیں گے۔

ننگی مرغیاں افسانے میں جب الطاف فاطمہ بازار میں جاتی ہیں تو انھیں وہاں بہت سی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ہر پل، ہر لمحے وہ ماضی میں کھو جاتی ہیں۔

> میرے ذہن میں گئے دنوں کی بازگشت ہے۔ مسلسل برستی پھوار تلے بھیگی بھیگی کیچڑ سے آلودہ سڑک پر چلتی ہوئی اس شام کے اندھیرے میں ہلالی وضع کی مارکیٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہی ہوں۔ میرے ساتھ چھوٹو بھی بھیگ رہا ہے۔ اس کی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تین قلم ہیں جن کی نبیں وہ بدلوانا چاہ رہا ہے۔ اس کا منہ فق ہو رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی ہیں۔ صبح میرا امتحان ہے اور مجھے ایک امتحانی گتہ بھی چاہیے۔[12]

الطاف فاطمہ نے بازار میں صرف لباس اور میک اپ کا سامان دیکھا تو وہ ایک دم ماضی کی طرف چلی جاتی ہیں۔ انھیں ماضی کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جب وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ بازار میں پن کی نِب بدلوانے آئی تھیں لیکن آج انھیں بازار میں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ انھیں یہ سب دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ماضی میں پناہ لیتی ہیں۔

> میں اس وقت کے گزر جانے پر تاسف کر رہی ہوں۔ جب نرکل اور کلک کے قلم چلتے تھے اور نِب بدلوانے کی خاطر بازاروں میں مارے پھرنے کے بجائے چپ چاپ قلم دان سے قلم تراش نکال کر زبانِ خامہ تراش لی جاتی تھی۔ بندہ اطمینان سے لکھتا اور فریر خامہ سے لطف اندوز ہوتا تھا اور ہماری عمر تو نبیں بدلوانے اور نبوں والے قلم کھولتے ہی گزری۔[13]

بازار میں دکانوں کا ڈیزائن تک بدل گیا ہے۔ وہاں ماضی کی کوئی شے نہیں موجود صرف اور صرف مارکیٹ کے تمام دروں میں برہنہ لاشیں اپنی لمبی کی ہوئی گردنوں سے ٹنگی ہوں۔ قیمتی ریشمی نرم لباس انھوں نے پہنے ہوئے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ بازاروں میں ننگی مرغیاں مطلب ننگی عورتیں موجود ہیں۔ اس وقت الطاف فاطمہ ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ بھیانک اور کرب میں ڈوبی ہوئی آواز کو یاد کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

> میں نے اس وقت وہاں کھڑے ہو کر اس کو بھی یاد کیا تھا۔ اس وقت کہ جب ایک نوجوان لڑکی اپنی ماں کی بانہہ کھینچ کھینچ کر بڑی التجا سے سامنے پھیلے ہوئے رنگوں کی قوسِ قزح کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر ایک قسم کی جھینپ تھی جس میں کرب کی آمیزش نے اس کے بھولے بھالے چہرے کو دھواں دھواں کیا ہوا تھا۔ [۴۳]

الطاف فاطمہ بازار میں جب لوگوں کو میک اپ اور لباسوں کی دکاس میں داخل ہوتے دیکھتی ہیں تو اسے ماضی کے بازار یاد آجاتے ہیں جب وہ بھائی کے ساتھ بازار جایا کرتی تھی۔ الطاف فاطمہ کو جزئیات کے ساتھ ماضی کا ہر لمحہ یاد آتا ہے اور وہ حال سے بھاگ کر ماضی میں کھو جانا چاہتی ہیں۔

الطاف فاطمہ کے افسانے چرواہا کے دو کردار کیا نتی اور شانتی بہت عرصے بعد جب کرسمس کے موقع پر ملتی ہیں اور ایک دوسرے کو ہیپی کرسمس کہتی ہیں تو بچپن کے گزارے کرسمس میں کھو جاتی ہیں۔ انھیں وہ واقعہ یاد آتا ہے جب وہ مندر گئیں۔

> شانتی! شانتی! ایک بات کہوں۔
> ویسا مزہ پھر کبھی کسی بات میں نہ آیا جو اس دن مندر میں چوری چوری پوجا کرنے میں آیا تھا۔
> کیوں۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔
> شانتی، جھوٹ کہتی ہوں؟
> سچی بات ہے کیانتی وہ صبح ہی اور تھی۔ وہ سمے ہی دوسرا تھا۔
> میری تو آنکھوں میں ودّیا کی دکان کے سفید بتاشے ناچتے ہیں۔ [۴۵]

اس افسانے کے دونوں کردار جو دو بہنیں ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ دونوں میں فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہی چیز الطاف فاطمہ کے افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن دونوں کردار جب حال سے ماضی میں جاتے ہیں تو ان کے درمیان خلا کم ہو جاتا ہے۔

"جب دیواریں گریہ کرتی ہیں" افسانے میں الطاف فاطمہ ماضی کے واقعات میں کھو جاتی ہیں۔ افسانے کی پہلی سطر "لاہور شہر سے تانگے رفتہ رفتہ ختم کر دیئے جائیں گے" ہے۔ یہ ایک خبر کی سرخی ہے۔ اس سرخی کو پڑھتے ہی

الطاف فاطمہ ماضی میں کھو جاتی ہیں کہ اب بسیں چل رہی ہیں لیکن اس سے پہلے تانگے ہی چلتے تھے۔ بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر انھیں انھی سڑکوں پر تانگے چلتے ہوئے، لوگوں کے ہجوم نظر آتے ہیں۔

> میرا خیال ہے کہ شاید میں نے ایک بچے سے پوچھا تھا۔ سوال کیا تھا، "تمہارے کل کتنے گھنٹے گھر پر گزرتے ہیں؟" اور یہ کہ "تم صبح کتنے بجے گھر سے نکل پڑتے ہو اور اگر تم اپنے اباماں کو کہیں دیکھو تو پہچان لو گے؟"۔ [۲۱]

وقت کے ساتھ ساتھ انسان بہت مصروف ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے پاس اپنوں کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔ اس لیے بس سٹاپ پر الطاف فاطمہ ماضی میں کھو جاتی ہیں کہ انھوں نے اپنے بچے سے اس لیے یہی سوال کیا تھا مگر انھیں بہت بری نظروں سے دیکھا گیا۔

بس سٹاپ پر بسوں کو چلتے دیکھ کر بس کا انتظار کرتے الطاف فاطمہ ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ انھیں وہاں تانگیں چلتے نظر آتے ہیں۔ گھوڑوں کی ٹاپ وغیرہ۔

> چھن چھن۔۔۔۔ چھن چھن۔۔۔۔۔ٹخ ٹخ۔۔۔۔۔ٹاپ ٹاپ۔۔۔۔(گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں کی قسم)۔ ایک دوسرے کو بچے گدگدا رہے ہیں چھیڑ رہے ہیں بابا سانٹا چلا رہا ہے گا رہا ہے کسی کو کھینچتا ہے، کسی کو گھرکتا ہے، حد یہ کہ زچ ہو جاتا ہے تو ماں بین بھی کرنے لگتا ہے اور ماں بہنیں گھروں میں جلد جلد کھانا تیار کرنے، ہانڈیاں اتارنے، دستر خوان بچھانے میں لگی ہیں۔ ان کو بچوں کی آمد کے اوقات کی خبر ہے۔۔۔۔ ٹاپ ٹاپ۔۔۔ چھنن چھنن۔۔۔۔ اور قسم ہے گھوڑوں کے سموں سے نکلنے والی چنگاریوں کی۔۔۔ کہ اب میری نظروں میں ایک خبر کی سرخی اور کٹنگ ناچ رہی ہے۔
> "لاہور شہر سے رفتہ رفتہ تانگے ختم کر دیئے جائیں گے۔ [۲۲]

وہ ماضی کی حسین یادوں میں کھو کر حال کو خوب صورت بنانا چاہتی ہیں۔ اس لیے وہ ماضی کی اقدار کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے کہ خود بخود ماضی سے اس کی قدروں سے محبت ہو جاتی ہے اور دل سے عزت کرنے کو دل کرتا ہے۔ جب بس سٹاپ پر کالی مرسڈیز ایک بچے کو کچل کر چلی جاتی ہے تو حال اور ماضی کے اس فیصلے سے انھیں بہت دکھ ہوتا ہے کہ ایک تانگہ والا بچوں کا بہت خیال کرتا ہے۔ وہی اس کا رزق ہیں۔ موتی دانے سب کچھ۔ لیکن کالی مرسڈیز کے لیے بچے کچھ بھی نہیں۔ آج ہزاروں بسیں ہزاروں بچے کچل کر آگے چلی جاتی ہیں اور انھیں اس بات کی پرواہ نہیں ہے۔ لاہور کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں تانگے ختم کر دیئے جائیں گے۔

الطاف فاطمہ جب ہوٹل میں ٹھہرتی ہیں تو ایسا کمرہ لیتی ہیں جہاں انھیں جنگل کا ایک خاص حصہ نظر آسکے۔ اس سب کی وجہ صرف گل بی بی اور میم تھی۔ جنگل کو دیکھ کر الطاف فاطمہ ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ "جب دیواریں گریہ

آج کی عورت ذلت کی پستیوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آج کی عورت میں شرم وحیا نہیں ہے۔ افسانہ "ننگی مرغیاں" میں انھوں نے علامتی انداز میں معاشرے میں پھیلتی ہوئی بے حیائی کو موضوع بحث بنایا ہے۔ عورتوں کا لباس ایسا ہے کہ جس سے سارا جسم نظر آرہا ہو۔ قیمتی لباس خرید کر بھی ریشمی سلسلاتے نرم کپڑوں میں ننگی نظر آرہی ہیں۔ اس لیے اس افسانے میں ان کا انداز خالص اصلاحی اور تبلیغی ہے۔ انھوں نے قرآنی آیات کے حوالوں کے ساتھ لوگوں کو تنبیہ اور سرزنش کی ہے۔ زمانے کی بدلتی اقدار کو دیکھ کر ان کا لہجہ طنزیہ ہو جاتا ہے۔

مصنفہ جب بازار میں جاتی ہے تو انھیں وہاں جابجا تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ وہ بازار جہاں شرم وحیا ہوتی تھی۔ لیکن آج وہاں ہر طرف بے حیائی نظر آرہی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے سب عورتیں ننگی ہیں۔ سروں سے دوپٹے اتارے ہوئے۔ تنگ وچست لباس پہنے ہوئے پھر رہی ہیں۔ مارکیٹوں کو دیکھ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔

> مسلسل برستی پھوار تلے بھیگی بھیگی کیچڑ سے آلودہ سڑک پر چلتی ہوئی اس شام کے اندھیرے میں ہلالی وضع کی مارکیٹ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہی ہوں۔ میرے ساتھ چھوٹو بھی بھیگ رہا ہے۔ اس کی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تین قلم ہیں جن کی نبیں وہ بدلوانا چاہ رہا ہے۔ اس کا منہ افق ہو رہا ہے۔ چہرے پر ہوائیاں سی اُڑ رہی ہیں۔ صبح میرا امتحان ہے اور مجھے ایک امتحانی گتہ بھی چاہیے۔[۱۳]

مصنفہ ماضی میں گم ہو کر ماضی کی تہذیب بیان کرتی ہیں کہ پہلے بازاروں میں قلموں کی نہیں بدلنے والی دکانیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ آج ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ آج ہر طرف بے حیائی پھیلی ہوئی ہے۔ ریشمی سلک کے لباس جابجا نظر آتے ہیں اور ماضی میں سب کا دھیان قلموں کی طرف ہوتا تھا لیکن آج قلموں سے زیادہ فیشن کی طرف دھیان ہے۔ ہر کوئی تبدیلی چاہتا ہے لیکن کیسی تبدیلی؟ آج سب کی آنکھوں میں تنہائی اور اجنبیت ہے جب کہ ماضی میں ایک دوسرے کے لیے لگاؤ اور انسیت نظر آتی تھی۔ مصنفہ ماضی کے مختلف حوالے دے کر حال اور ماضی کا تقابل کرتی ہیں۔ اس طرح ماضی کی تہذیب وثقافت کو کرداروں کے ذریعے بیان کرتی ہیں۔

"جب دیواریں گریہ کرتی ہیں" افسانے میں مصنفہ بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کر رہی ہے۔ ایک خبر کی سرخی اسے حال سے ماضی میں لے جاتی ہے کہ لاہور شہر سے تانگے ختم کر دیئے جائیں گے۔ مصنفہ تانگوں کا ذکر سن کر ماضی میں گم ہو جاتی ہیں کہ ماضی میں صرف تانگے چلا کرتے تھے اور وہ سواریوں کو بحفاظت ان کی منزل تک پہنچاتے تھے۔ بچوں، ماؤں بزرگوں اور تانگہ والوں کا آپس میں ایک رابطہ ہوتا تھا۔

> باباجی! بچے کو بڑی حفاظت سے لے جانا۔ بڑی تاک سے واپس لانا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن اسکول میں ہی کھیلتا رہ جائے اور تم اس کو بھول آؤ اور یہ پھر اکیلا نکل پڑے۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ بی بی، فکر

کرتی ہیں۔" میں افسانے کے دوسرے حصے میں الطاف فاطمہ ماضی کے اس واقعے کو مکمل طور پر بیان کرتی ہیں اور ماضی میں ہر وقت کھوئی رہتی ہیں۔ ریسٹ ہاؤس میں نوکری آتی ہے اور گل بی بی وہاں نوکری کرنے جاتی ہیں۔ انھیں ہمیشہ میم بہت عجیب سی لگتی ہیں۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرتی رہتی ہے۔

> دن کے وقت جنگل میں پھرا کرتی۔۔۔۔ کبھی کوئی پتی اٹھالیتی، کبھی کوئی بوٹی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ گل بی بی تمھارے گاؤں میں جادو ٹونے سے کوئی علاج کرتا ہے! مجھے پہلے ہی شک پڑ گیا تھا یہ کوئی شیطانی کام ہے۔۔۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ بی بی، ہم مسلمان جادو نہیں جگاتے۔ جنگل کی جڑی بوٹی سے فائدہ نہ ہو تو نیچے جاکر پیر فقیر سے تعویذ لکھوالاتے ہیں [18]

میم کی کہانی ہی الگ تھی۔ شریف بہت تھی۔ ہر وقت لکھنے میں مصروف رہتی تھی۔ کاغذوں کے بنڈل بنا کر نیچے چلی جاتی اور بہت دنوں بعد واپس آتی۔ ہوٹل کے اس کمرے میں الطاف فاطمہ کو ماضی کے وہ تمام لمحے یاد آتے ہیں۔

> دیکھو یہ میں نے خاص مقصد سے لی ہے۔ یہاں اس طرح بیٹھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آرہا ہے۔ یاد کیا آرہا ہے ہر چیز، ہر منظر اتنا صاف نظر آرہا ہے۔ ایسی ہی چاندنی راتوں میں۔۔۔۔۔ [19]

ہوٹل کے قیام کی رات میں انھیں گل بی بی اور میم کا مکمل واقعہ آنکھوں کے سامنے گردش کرتا رہتا ہے۔ ہر منظر آنکھوں کے سامنے گھومتا ہے۔ ماضی میں، پاسٹ کے ناسٹلجیا میں گم ہو جاتی ہیں کہ انھیں یاد آتا ہے۔ جب ان کی میم سے ملاقات ہوتی ہے۔

> وہ مجھے بالاکوٹ کے لاری اڈے پر ملی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں میں شہانی چوڑیاں، بڑے بڑے پھولوں والی سرخ چھپنٹ کی تنگ مہری کی شلوار اور گھیر دار کرتا۔ چوٹی میں گھنگروں والا پراندہ سجائے خوب چمک رہی تھی۔ [20]

الطاف فاطمہ اس افسانے میں صرف گل بی بی اور میم کے واقعات میں ہی نہیں گم ہوتی بلکہ اس جنگل کی خوب صورتی، اپنے بچپن میں کھو جاتی ہیں جس بچے کو لینے کے لیے وہ اتنا سفر کرتی ہے۔ اس بچے کا تعلق گل بی بی سے ہے۔ اس سب کو دیکھ کر ایک شہر کی دیواریں گریہ کرتی ہیں لیکن دکھ، تاسف، غم سے الطاف فاطمہ کے وجود کی ساری دیواریں گریہ کرتی ہیں۔

ان کے افسانوں میں ماضی پسندی کا عنصر تعمیری ہے۔ بخریبی نہیں۔ وہ حال کے منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے ماضی کے ادوار کا جائزہ لیتی ہیں اور ان گزرے ہوئے لمحات سے بے نام محبت، چاہت، وفا اور ہمدردی کا جوہر کشید کرکے دوبارہ زمانہ حال میں محو ہو جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:

الطاف فاطمہ کے ہاں حزن و یاس اور مایوسی کے دبیز کہر سے رومانیت کی ایک دوشیزہ کرن بیدار ہوتی ہے اور زندگی کی نوید بن جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کا عام تاثر افسردگی پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس افسردگی پر افسانے کی مجموعی رجائیت غالب رہتی ہے۔ [۲۱]

الطاف فاطمہ کے افسانے مثبت غبار میں بھی ان کا ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ خوب صورت عالیشان کوٹھیوں کو دیکھتے ہی اپنے زمانے کے گھروں میں گم ہو جاتی ہیں۔

پچھلے زمانوں میں باہر سے اتنی ٹیپ ٹاپ نہ ہوتی تھی۔ اندر سے باہر تک ایک لطیف ہمواری کے سوا کوئی چکاچوند اور خیرہ کرنے والی شے نہ ہوتی۔ محلہ ملی جلی حقیقتوں کے امتزاج سے بنتا تھا۔۔۔۔ پہلے محلے کے گلی کوچوں کے نام ہوتے تھے۔ گلی مرزا دبیر، کوچہ اعظم بیگ، چھنہ لال میاں۔ ان گلیوں، چھتوں اور کوچوں میں بنے ہوئے اونچے اونچے مکان، دیوار بیچ نکالی ہوئی کھڑکیوں کے ذریعے منسلک رہتے تھے۔ احتیاج کی ایک صدا، دکھ کی ایک کراہ اور کبھی کبھی گہری خاموشی بھی پورے محلے کو باخبر اور یکجا کر دیتی تھی۔ [۲۲]

الطاف فاطمہ حال اور ماضی کا تقابل کرتی ہیں۔ انھیں ماضی ہمیشہ دلکش اور خوبصورت محسوس ہوتا ہے اور ماضی کو اس طرح خوب صورت انداز میں پیش کرتی ہیں کہ قاری کو خود بخود ماضی میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ الطاف فاطمہ کو جب حال میں کوئی بھی چیز دیکھتی ہے تو اس سے جڑا ماضی کا واقعہ، ناسٹلجیا اس کے ذہن میں آتا ہے اور یہی واقعات بیان کر کے وہ آسودگی محسوس کرتی ہیں۔ حال میں جب وہ انیکسی میں مقیم تھیں تو حال کی خوبصورت کوٹھیوں کو دیکھتے ہوئے انھیں ماضی کے کچے گھر یاد آجاتے ہیں لیکن ماضی میں سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے شریک ہوتے تھے۔ لیکن آج سب ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ اس دکھ کو کم کرنے کے لیے جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو بازار میں بھی مٹی کے برتنوں، ماضی کی اشیاء کو شدت سے یاد کرتی ہیں، کورے کورے سرخ سرخ سفالیں، پیالے، کنڈالیاں انھیں قدیم زمانوں میں پہنچا دیتی تھیں۔ انھیں وہ زمانہ شدت سے یاد آتا ہے جب کرنسی کے بجائے تبادلہ اجناس کا سسٹم چلتا تھا۔

ایوان میں سفید براق چاندنی کا فرش تھا۔ اس پر کاشانی قالین بچھا تھا۔ مخملیں گاؤ تکیے سے ٹک لگائے، اس عہد کے ہنرور نے اپنی دراز ریش پر فکر یہ انداز میں ہاتھ پھیرا قلم دان کو ذرا اور قریب کیا۔ شہر کے محلوں اور گلی کوچوں کی آبادی کے ساتھ ساتھ ظل سبحانی نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اجناس اور اشیاء کے بیوپاری اپنی اجناس کو پھیری لگا آواز اور صدا سے فروخت کریں تاکہ بی بیوں اور گرستینوں کو اشیائے ضرورت گھر بیٹھے اور اپنی پسند سے مل جائیں۔ [۲۳]

لیکن آج کی مارکیٹوں اور شاپنگ پلازوں کے سامنے ظلِ سبحانی کا دور ماند پڑ جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ عبداللہ بھی رہتا تھا۔ ماضی میں جب کوئی تن تنہا ہوتا تھا تو محلے کے سب لوگ اس کی تنہائی کو دور کرنے کی کوشش کرتے، اس کا ساتھ دیتا لیکن آج کے دور میں سب اپنے گھروں میں بند ہیں۔ جدید دنیا میں اتنا گم ہو چکے ہیں کہ کسی کے دکھ سکھ کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ الطاف فاطمہ جب عبداللہ کے جانے کے بعد تنہائی محسوس کرتی ہیں تو انھیں ماضی کا دور افسردہ کر دیتا ہے اور شدت سے ماضی میں جانے کی خواہش کرتی ہیں۔

> کاش میں اس دور میں زندہ ہوتی جب دیواروں پر گھر تا گھر کھڑکیاں ہوا کرتی اور خوف یا الم کی ایک چیخ درد و کرب کے عالم میں نکلی ہوئی ایک کراہ آن واحد میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سننے کو اس گھر میں جمع کر دیا کرتی تھی۔ جہاں ان کی ضرورت ہوتی۔ بس ایک آن میں سارے فاصلے اور دوریاں طے ہو تیں۔ اونچی اور ریختہ دیواروں کی ساری رکاوٹیں دھند کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ [۲۴]

مانگنے والے کو ہر دور میں برا سمجھا جاتا ہے۔ ان کو ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔ نرگس جو کہ ایک کھسرا ہے۔ الطاف فاطمہ کی اس سے اچھی جان پہچان ہو جاتی ہے جو ہر پل ہر لمحے ان کا خیال رکھتی ہے۔ ضرورت کے وقت موجود ہوتی ہے۔ جب جب وہ الطاف فاطمہ کے کام کرتی تھی۔ انھیں اپنے ماضی کا واقعہ یاد آتا ہے۔ جب انھوں نے مانگنے والوں کے خلاف تاک کی تھی۔

> مجھ سے ریڈ والوں نے مانگے تانگے والوں کے خلاف ٹاک لکھوائی اور کروائی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں لکھی ہوئی اس ٹاک پر آج میں نادم ہو رہی تھی۔ مانگے تانگے میں کیا برائی ہے۔ اس بہانے ایک دوسرے کی خیر خبر تو رہتی ہے۔ یہ تو نہیں کہ جس گھر کی طرف دیکھو سختی سے دروازے بند، کھڑکیاں بند، انسان نہ ہوئے ہیرے جواہرات ہو گئے کہ آہنی تجوریوں میں بند مقفل پڑے ہیں۔ [۲۵]

انھیں یہ سوچ سوچ کر دکھ اور حیرت ہوتی ہے کہ آج کے دور میں انسان انسان سے دور کیوں بھاگتا ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی سوچ بھی بدل گئی ہے۔ کچھ لوگ ماضی سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ ماضی سے بھاگنا چاہتے ہیں لیکن الطاف فاطمہ ماضی کو یاد کر کے واقعات کو بیان کر کے فخر محسوس کرتی ہیں۔ الطاف فاطمہ اپنے ناسٹلجیا کے بارے میں کہتی ہیں:

> نوسٹلجیا کچھ اتنی بری چیز تو نہیں کہ ہم اس سے الرجک ہونے لگیں اس سے تو بڑے بڑے خاکے اور نقشے ابھرتے ہیں۔ [۲۶]

الطاف فاطمہ کا افسانہ مچھلی ناسٹلجیا کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ مچھلی سے مراد افسانے کی ایک کردار ہے جس

کی شکل مچھلی سے مشابہت کرتی ہے۔ بازار میں اچانک جب وہ مچھلی کو دیکھتا ہے تو اسے وہ تمام واقعات یاد آتے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ مچھلی سے ملاقات ہوئی اور کلاس میں مچھلی کو کس کس طرح سب طالب علم تنگ کیا کرتے تھے۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں سیل میں نہیں۔ بس اسٹینڈ پر کھڑا ہوں اور وہ اپنے دستے کو اپنی قیادت میں مارچ کراتی آ کھڑی ہوئی۔ لیکن آج دستے کے بجائے ایک عدد اس کے بازوں میں محفوظ تھا۔ ایک اس کا پلو پکڑے، انگوٹھا منہ میں لیے اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا۔ [۲۷]

افسانہ مچھلی کے ساتھ گزرا وقت، ماضی، ناسٹلجیا کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ یہ ماضی کے چھوٹے چھوٹے واقعات حال میں جینے کا سہارا ہوتے ہیں۔

ان کا خیال آتا تو آثارِ قدیمہ کے کنبے کی وہ ہر لحظہ ڈھے جانے اور سر پر آ گرنے کی دھمکیاں دیتی کالج کی عمارت، مریل سی کینٹین، ہونق سے لڑکے اور بس اسٹینڈ کے معرکے بمعہ مچھلی سب ہی ذہن میں تازہ ہو جاتے۔ [۲۸]

مچھلی کو دیکھ کر اس کو وہ پچھلے تمام واقعات یاد آنا شروع ہو گئے جب پوری کلاس کے لڑکے مچھلی کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر مچھلی کو شادی کے لیے منانا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ زندگی کی دوڑ میں دونوں بہت آگے چلے گئے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کو دیکھ کر پچھلے تمام واقعات جزئیات سمیت آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

پتا ہے۔ اس مقررہ تاریخ کو میں شام پانچ بجے سے گیارہ بجے رات تک بس اسٹینڈ پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ایمان سے اتنا احمق اور ہونق لگ رہا تھا۔ لوگ خاص طور پر بس اسٹینڈ کے ساتھ کے کھوکھے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ [۲۹]

مچھلی افسانے کے کردار ناسٹلجیا کا احساس اور شعور رکھتے ہیں۔ انسان بیتے دنوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ بچپن کے دن کاغذ کی کشتی، بارش کا پانی، کالج کے دن، گلی، محلہ، کھیت اور پرانا اندازِ زندگی ہمیشہ یاد آتا ہے۔ ناسٹلجیا کا شعور انتہائی تکلیف دہ ہے۔ جب ہم پیچھے مڑ کے دیکھتے ہیں کہ جس قافلے میں ہم نے بچپن سے سفر شروع کیا تھا۔ وہ منظر کتنا بدل چکا ہے۔ کتنے لوگ شریک سفر تھے۔ مگر آج اس سفر میں شامل نہیں ہیں۔ شب و روز، ماہ و سال پلک جھپک میں بیت جاتے ہیں اور صرف یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔ ہر خوشی، غم کے موقع پر، ہر نیا موسم آنے پر پرانی یادیں آواز دیتی ہیں۔ بیتا کل آج کی یادیں ہیں اور آنے والا کل آج کے خواب ہیں۔

مچھلی کے گھر جب اس کے تایا اپنی فیملی کے ساتھ رہنے کو آئے تو مچھلی کو بچپن کے دن یاد آنے لگے۔ کس طرح مہمانوں کے آنے پر اہتمام ہوتا تھا۔

اماں جی چھوٹے بھائی کو سبزی گوشت اور نہ جانے کیا کچھ لینے دوڑا چکی تھی۔ مجھ سے چھوٹی بہن اور آپی

ہماری کزنز کے ساتھ مل کر بکسے، ٹوکریاں اور تایا جان کا حقہ اندر لے جا رہی تھیں۔ گھر میں کیسی گہما گہمی آگئی تھی۔ پورا گھر ہنسی اور محبت بھری باتوں سے بھر گیا تھا اور ہمارے گھروں میں ہوتا ہی کیا ہے، نہ نام نہ نمود نہ قالین، نہ ساز و سامان، بس محبت، سلوک، ہنسیاں اور قہقہے، بے تکلفی اور ہمار ساتھ تو یہ ہے نا کہ تایا جان کی ایک لڑکی ہم تینوں کی ہم سن ہے۔ وہ آجائیں تو نہ دن دن رہتا ہے، نہ رات رات۔۔۔ باتیں، شرارتیں، چھیڑ چھاڑ، گپیں، تاش، کیرم کی بازیاں لگ رہی ہیں۔ چائیں تیار ہو رہی ہیں، گنے چوسے جا رہے ہیں۔ [۳۰]

انسان ماضی کی یادوں سے اکثر وابستہ رہتا ہے۔ اس طرح وہ کبھی کبھی لمحہ موجود میں غم کا مداوا کسی خوشگوار یاد سے کرتا ہے یا پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے غم کی یاد سے براہِ راست قرب محسوس کرتا ہے۔ فرد کا کردار کسی نہ کسی طور پر ناسٹلجیا میں گرفتار ہوتا ہے۔ اسی طرح مچھلی افسانے کے دونوں کردار مچھلی اور اس کا دوست دونوں کے ہاں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ دونوں کا آج کل سے یکسر مختلف ہے لیکن پرانے دوست عیشہ مل کر گئے دنوں کو گزرے لمحات کو اور واقعات کو یاد کرتا ہے۔ اس طرح یہ پورا افسانہ ماضی کے واقعات کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔

الطاف فاطمہ کا فاسنہ نما ناجیسا آدمی میں بھی ناسٹلجیا موجود ہے۔ شاپنگ پلازہ کے سامنے ہجوم اور شور سنائی دیتا تھا۔ باہر دیکھنے پر جب لوگوں کا ہجوم دیکھتی ہیں تو ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔

بچپن میں چاندنی راتوں میں ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ سارے بچے گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایک کمر جھکی بڑھیا (وہ بچہ ہی ہوتا) لاٹھی ٹیکتی چاروں اور کچھ ڈھونڈتی کھوجتی گھیرے میں داخل ہوتی۔ بڑھیا بڑھیا کیا ڈھونڈتی۔

بچے سوال کرتے۔۔۔ سوئی! جواب ملتا۔ پھر بچے سوال کرتے۔۔۔ بڑھیا جواب دیتی۔ [۳۱]

بچپن کے کھیل ہمیشہ خوبصورت ہوتے ہیں اور جب کسی کو دوبارہ وہی کھیل کھیلتے دیکھیں تو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔ یہی ناسٹلجیا الطاف فاطمہ کے ہاں نظر آتا ہے۔ کتب بینی کا سب کو شوق ہوتا تھا۔ لیکن آج کل ایسا کچھ نہیں ہے۔ افسانہ شیر دھان میں انھوں نے جدید معاشرے سے کتب بینی سے دوری کے المیے کو بیان کیا ہے۔ کتب خریدنا اور پڑھنا طالب علموں کی سب سے بڑی تفریح تھی اور اس کی وجہ سے معاشرے میں موجود افراد کا رشتہ ادب اور اپنی تہذیب سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج ہم اپنے علمی و ادبی ورثے سے یکسر بے خبر ہو کر آگے ہی آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اس افسانے میں جب کتابوں والے سر جدید زمانے کے بچوں کو دیکھتے جو صرف جدید دنیا میں مگن ہیں۔ ان کا ماضی سے کتابوں سے کوئی لینا نہیں تو ماضی کے اس واقعے میں پہنچ جاتے ہیں جب ہر وقت بچے ان کی دکان پر موجود رہتے تھے۔

دکان کا تمام تر چارج کتابیں تلاش کرنے سے لے کر گلے میں پیسے ڈالنے کا عمل بچوں کے ہاتھ میں رہتا۔ بیک وقت چار چار پانچ مل کر الماریوں کے اوپر تختوں پر بیٹھے ہوتے۔۔۔ کتابیں ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ساتھ پڑھ بھی رہے ہیں۔۔۔ بس ایک چونی تھما کر اچھی سے اچھی کتاب پڑھنے کو مل جاتی۔ [۳۲]

ان کے افسانوں میں وقت کے گزرنے کا کرب ناک احساس ملتا ہے۔ یہی احساس انھیں ہر لمحے احساسِ زیاں سے دور چار کیے رکھتا ہے۔ دراصل وقت ایک ہوا کے جھونکے کی مانند ہے جو کسی کے روکنے سے نہیں رکتا بلکہ مسلسل چلتا رہتا ہے۔ لیکن گزرے ہوئے وقت کی یادیں ہمیشہ انسان کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں اور وقتاً فوقتاً انسان کو ماضی کے ان لمحات میں دوبارہ واپس لے جاتی ہیں۔ مہرہ جو پٹ گیا افسانے کا کردار سکندر بخت ایک بالر ہے۔ اس کے اندر ماضی زندہ ہے۔ سکندر بخت کی یاد آتے ہی انھیں سکندر بخت کی آمد کا واقعہ یاد آتا ہے۔

ایک بھرپور اپنے منتظر گاہکوں پر ڈالتے ہوئے استاد اپنی آستینیں اوپر چڑھاتا، کھونٹی پر سے سفید براق اوور آل بالکل سرجنوں کے انداز میں پہنتا، کیبن کے دروازے پر کھڑے ہو کر وہ چشم و آبرو سے اشارہ کرتے کرتے زیر مونچھ تبسم کرتا تو اس کے فن اور مہارت کا اسیر گاہک بے داغ سفید پردہ سر کا کر اندر داخل ہوتا اور ساتھ ہی باوقار انداز میں نپے تلے قدموں وہ بھی اندر جاتا۔ [۳۳]

سکندر بخت کی زندگی کو بیان کرتے کرتے وہ جنگِ عظیم کو بھی بیان کرتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سکندر بخت کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آتیں جب سکندر بخت سے وہ بال بنوانے گیا تو انھیں کل اور آج کے سکندر بخت میں واضح فرق نظر آیا۔ الطاف فاطمہ کے تمام افسانوں میں ماضی اور حال کا فرق موجود ہے۔ ایک کشمکش نظر آتی ہے۔

خیال بیاباں نورد افسانے مُس سلیمن کا کردار خاموش لڑکی کا کردار ہے جسے قیصر نامی لڑکے سے ہمدردی تھی۔ سلیمن کی رخصتی کے وقت مسجد میں سلام پڑھایا جا رہا تھا۔ اس سلام کو ہنتے ہی سلیمن کو ماضی میں قیصر کا مسجد میں جا کر سلام پڑھنا یاد آتا ہے۔

جس وقت وہ رخصت ہو رہی تھی۔ اس وقت مسجد میں سلام پڑھا جا رہا تھا۔
کملی دوش پر دھری ہے۔
خوشبو زلف میں بھری ہے۔
ہر ادا میں دلبری ہے۔
شان بندہ پروری ہے۔

اچانک ہی اس کے کانوں میں قیصر کی آواز کی بازگشت گونجنے لگی۔ کہتے ہیں جس کی رنگت کالی ہوتی ہے۔ اس کی آواز بڑی میٹھی ہوتی ہے۔ [۳۴]

الطاف فاطمہ کے افسانہ کنڈیکٹر میں لالو کا کردار اور اس کا ماضی بیان کیا گیا ہے۔ محلے میں جب سب کو لالو کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے ٹیچر سے شادی کر لی ہے۔ کراچی میں اچھا بزنس جمانے کے ساتھ ساتھ بنگلہ بھی لے لیا ہے تو سب کو اس کا ماضی یاد آجاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر انسان کے ساتھ موجود ہے۔ جس کے ساتھ اس نے بچپن گزارا ہو۔ بڑے ہو کر جب اس کی خبر ملتی ہے تو ماضی کی یاد خود بخود آجاتی ہے اور الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا جابجا موجود ہے۔

> لالو جب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کی تعلیمی رفتار سست اور مایوس کن تھی۔ اس کے خدوخال پر حماقت کی چھاپ کسی دوسری کیفیت سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس پر تتلاہٹ وہ بھی ایسی کہ کاف کو ٹاف اور گاف کو ڈاف کہتا۔ اس نے اپنی پوری کنگ ریڈر اسی انداز میں رٹ رکھی تھی اور ہمارے مشترک ٹیوٹر یعنی ماسٹر کا کہنا تھا کہ خبیث کو ایک لفظ نہیں آتا اور یہ اس نے صرف رٹ رٹا لیا ہے کہ وقتِ ضرورت کام آسکے۔ [۳۵]

وطن کی آزادی میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ اس لیے ہر ۱۴ اگست کو وہ شدت سے یاد آتا۔ کس طرح وہ سکول جانے کے بجائے مسلم لیگ کا کارکن بن جاتا اور گھر سے غائب ہو جاتا۔ یہی سب یادیں ماضی کا حصہ ہے۔ یہی ناسٹلجیا تمام افراد کے ہاں موجود ہے۔

> مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب لالو اور اس کا بھائی صبح نکلے اور دوسری صبح تک نہ پہنچے۔
> تمام رات ان کی اماں روتی رہتیں۔
> ارے میرے دونوں مٹ گئے۔ اب تو لاشیں ہی آئیں گی۔ تمام رات ہماری والدہ انھیں تسلیاں دیتی رہیں۔۔۔۔
> مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ ماسٹر صاحب نے دونوں کو لٹالٹا کر مارا۔ [۳۶]

الطاف فاطمہ نے خود ہجرت دیکھی تھی۔ ہجرت کے تمام واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے چلتے رہے۔ ہجرت کی وجہ سے ان کے ہاں ناسٹلجیا موجود ہے۔ یہ اپنے بچپن کے گزرے لمحات کو ان گلیوں کو شدت سے یاد کرتی ہیں۔ اس لیے اس افسانے میں آزادی کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے جس صبح پاکستان بنا وہ صبح یاد ہے۔

الطاف فاطمہ ماضی کو نہ صرف یاد کرتی ہیں بلکہ شدت سے اس کے لوٹ آنے کی خواہش کرتی ہیں کہ کاش وہ وقت لوٹ آئے اور وہ اس وقت میں دوبارہ سے جینے کی آرزو کرتی ہیں۔ افسانہ تار عنکبوت کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے اندر ایک خواہش بہت شدت سے موجود تھی اور آہستہ آہستہ وہ خواہش ارمان میں بدلتی جا رہی تھی کہ گھر کے کسی کونے میں مکڑی کا جال نظر آئے کیونکہ اسے وہ واقعہ یاد ہے۔ جب اس کی ماں مکڑی کے جالے اتارا کرتی تھی۔

اسی وجہ سے وہ ماضی کی طرف مراجعت کرتی ہیں۔

اماں جان۔ گھر کے ملازم چھوکرے کے ہاتھ میں گودڑ بندھا بانس تھما کر چور مچاتی پھرتی تھیں۔
ارے یہ دیکھو بھئی ادھر یہ دیکھو۔
ہر نئے جالے کو دیکھ کر نئے سرے سے مکڑیوں پر ناراض ہونے لگتیں ان کی شکایتیں کرنے لگتی تھیں۔
بغیر کسی کو مخاطب کیے۔ "دیکھو تو! کتنے جالے لگا لیتی ہیں۔ یہ کم بخت مکڑیاں۔" [۳۷]

کس طرح وہ اپنی ماں کو منایا کرتا تھا۔ انھیں مکڑی کے جالے اتارنے سے منع کرتا اور منع کرتے ہوئے اسلامی تاریخی واقعے کا ذکر کرنا ناسٹلجیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ مکڑی کا مقصد یہ ہو کہ جب کسی خدا کے بندے پر اس کی زمین تنگ ہو جائے اور اسے وہاں رہنے نہ دیا جائے اور وہ وہاں کسی غار میں جا کر چھپنے کی کوشش کرے اور نکالنے والے وہاں بھی اس کا پیچھا کریں تو اس وقت مکڑی جالا تن کر غار کا منہ بند کر دے اور کبوتر جالے میں انڈے دے دیں اور پیچھا کرنے والے یہ سوچ کر چلے جائیں۔ [۳۸]

ہزاروں یادیں ذہن کے پردوں پر ابھرتی ہیں جنھیں انسان بھولنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ یہی یادیں اس کے آنگن میں چراغاں کر دیتی ہیں۔ عید کے دن بھی کیک اور زبردست لنچ کرتے ہوئے ماں کا شیر خورمہ اور سویوں کا زردہ یاد آنا۔۔۔ ناسٹلجیا ہے۔

ان کے ہاں ناسٹلجیا اس حد تک موجود ہے کہ ماضی کے لوگوں کو تلاش کرتی۔ ان سے ٹلنا ان کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی۔ کبھی کبھی کسی فرد کو دیکھ کر اس میں اس کا ماضی تلاشتی جیسے۔

میں تو اس لڑکے کو تلاش کر رہی ہوں جو گھر میں وارد ہوتا تو ایک اودھم مچ جاتا۔ گھر کی دیواریں اور دروازے کھڑکیاں تک پناہ مانگنے لگتی تھیں۔ امتحان میں مصروف لڑکے لڑکیاں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتے۔ یا اللہ ان کی پوسٹنگ ہی کہیں اور ہو جائے۔ [۳۹]

وہ جب بھی اسے جوانی میں دیکھتی تو اس کے بچپن کے واقعات یاد آتے۔ وہ اُن دنوں سے کتنا مختلف ہو گیا تھا۔ وقت کی تبدیلی نے اس پر اثر کیا تھا۔ وہ وقت جو گزر کر سب کا ماضی بن جاتا ہے لیکن انھیں اس کا ماضی بہت الگ اور مختلف دکھتا تھا۔

شام ہوتی تو وہ ڈار سے بچھڑی گونج کی طرح بار بار منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ دن کے اجالے ڈھلتے تو وہ رہ رہ کر اس کو اپنے سنگی ساتھی ان کے ساتھ جھیلے ہوئے دکھ اور اپنی کی ہوئی شرارتیں یاد آنے لگتیں۔۔۔ ان ہی لمحوں میں تو وہ لمحہ بھی چھپا ہوا تھا۔ جب اس کا چلبلا خوبصورت ساتھی، انتظار کی طوالت سے اکتا کر بھاگ نکلنے کی کوشش میں کیمپ کے خاردار تاروں میں الجھا اور گارڈ کے دستے کی

گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ [۴۰]

الطاف فاطمہ اپنے ناسٹلجیا میں گم ہو کر حال کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں اور ماضی کو ایسے بیان کرتی ہیں جیسے حال کے بجائے انسان ماضی میں جی رہا ہو۔ "رتن چوٹ" افسانے میں آپا چہرے بنایا کرتی تھی۔ وہ جب بھی ہنستی تو مادہ ہستی کی گردن یاد آجاتی۔

> مجھے ہمیشہ مادہ ہستی کی گردن یاد آجاتی۔۔۔۔ جو میں نے ایک مرتبہ گھاٹ کی لہروں پر بہتی یا تیرتی دیکھی تھی۔ وہ موجوں پر جیسے بہی چلی آتی تھی۔ اس کا ہن کچھ پیچھے رہ گیا تھا اور وہ گردن کو ہلکا سا خم دیئے اس کو مڑ مڑ کے دیکھتی تھی۔ [۴۱]

اس افسانے میں آپا جو چہرے بنایا کرتی تھی۔ ان کا نام رتن چوٹ رکھا اور جب یہ چہرے اس کے بھائی کے پاس تھے تو اچانک سے صوفیہ (بیوی) کی دوست کو دیکھا۔ ایسے لگا جیسے ماضی میں پہنچ گیا ہو۔ آپا چہرے بنا رہی ہوں اور وہ چہرہ رتن چوٹ کا چہرہ ہو بہو صوفیہ کی دوست کا تھا۔ بس اس میں جان بھر دی گئی ہو۔ اس کے ساتھ آپا کے بچے بھی یاد آئے اور واقعات یاد آنا شروع ہو گئے۔

> جب میں نے بغیر اس کا نام لیے اشارتاً اس پہرے داری اور چوکسی کا ذکر کیا پھر اس کی سدا بہار خندہ جبینی اور تحمل (یہ واقعہ تھا میں دو سال تک تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اس کے دفتر جاتا رہا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس کو ماتحت حد یہ کہ چپراسی تک سے گرم بات یا کسی پر گرم نگاہ ڈالتے نہ دیکھا تھا) کے حوالے سے کہا کہ کچھ لوگ واقعی عظیم ہوتے ہیں جن کے ماتھے پر کبھی بل نظر آتا ہے نہ چہرے پر گرد ملال۔ [۴۲]

افسانے کا مرکزی کردار جو آپا کا بھائی تھا۔ جب جب رتن چوٹ سے ملاقات ہوتی۔ آپا کے ساتھ گزارے لمحے یاد آتے۔ بچپن کے ساتھ گزارے گئے واقعات، ماں کی ڈانٹ سب نظروں کے سامنے گھوم جاتے۔ ان کا افسانہ "خستہ خانم" بھی ماضی کی یادوں میں گم ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جب اچانک سے اپنی بچپن کی دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو ماضی، بچپن کے کھیل یاد آجاتے ہیں۔

> پھر میں نے اس کو غلیلیں بنانا سکھائی ہوئی تھیں۔ ہم چونکہ مشن اسکول میں اکٹھے پڑھتے تھے اور جب ہماری غلطیوں پر ہم جماعتوں کی للچائی نظریں کچھ زیادہ ہی پڑنے لگیں تو ہم اپنی غلیلیں بیچ دیا کرتے تھے۔ اچھا خاصا کاروبار جم گیا اور دھندا چل پڑا تو کام بھی بڑھ گیا۔ میں مناسب اور اچھے اچھے دوشانے کاٹ کر لاتا۔ وہ ان کو تیز قلم تراش سے چھیل چھیل کر ہموار اور چکنا کرتی۔ پھر میں سائیکلوں کے پرانے ٹیوب فراہم کرتا اور وہ قینچی سے ان کی پتلی پتلی پٹیاں کاٹتی، غلیلوں کے ساتھ ہم غلے بھی دیا کرتے۔ ایک غلیل کی ہمراہی میں سات غلے بناتے۔ [۴۳]

آج جب اچانک لیلیٰ کو دیکھا تو وہ حیران ہو گیا اور اسے ماضی کے واقعات یاد آنے لگے۔ کیوں کہ آج وہ بہت ماڈرن ہو چکی تھی۔ کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے کا انداز بدل گیا تھا۔ آج کل تو بی۔اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی اور بہت چالاک ہو گئی تھی اور بے تحاشا اچھی لگ رہی تھی۔ الطاف فاطمہ کی طرح ان کا مرکزی کردار بھی ماضی کی یادوں میں گم نظر آتا ہے۔ حال اور ماضی میں زبردست تضاد اور اختلاف نظر آتا ہے لیکن ماضی کو خوب صورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لیلیٰ کے ساتھ مل کر وہ اس کا خستہ خانم سے موازنہ کرتا ہے اور موازنہ کرتے ہوئے وہ اس کی یادوں میں گم ہو جاتا ہے اور اسے اس کے گھر جانے کے واقعات یاد آتے ہیں۔

> وہ چلتی چلتی ایک گنجان علاقہ کے لکڑی کے ٹال کے عقب میں چھیروں سے بنی جھونپڑیوں میں گھس گئی تھی اور وہاں جا کر اپنی چادر آرام سے اتار کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد لمبے لمبے کرتوں اور ننگی ٹانگوں والے یا برہنہ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے تو اس نے باری باری ان کو گود میں اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے ان کے گندے گندے میلے میلے منہ دھلائے، بال سنوارے پھر ان کی چاند سی پیشانیوں کو چوم چوم کو بڑی سی چارپائی پر بٹھایا۔ تھیلے میں سے ننھے ننھے قاعدے اور سیٹیں نکالیں اور ان کو پڑھانے لکھانے بیٹھ گئیں۔ [۴۴]

خستہ خانم بچوں، جوان، بوڑھوں سب کا خیال رکھتی تھی۔ بچوں میں ٹافیاں تقسیم کرتی اور اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو اسے خود ہسپتال لے جاتی لیکن آج کے دور میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ تمام تہذیبی قدریں ختم ہو چکی ہیں۔

وہ جسے چاہا گیا افسانے کا مرکزی کردار جم نکولس بھی ماضی کے واقعات میں گم نظر آتا ہے۔ اس کی دوست کے نام کے معنی وہ جسے چاہا گیا تھے۔ بار بار نام سوچنے کے باوجود نام نہیں یاد آ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ گزارے گئے پل یاد آ رہے تھے اور وہ واقعہ جب وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔

> وہ سادہ سادہ سا، چپ چپ سا ریشمی آنکھوں والا چہرہ تو صاف صاف پیشِ نظر تھا جس کے نام کے معنی ذہن میں گھوم گھوم کر خواہ مخواہ اس کو یعنی پنتالیس سالہ کنوارے، شعبہ صحافت کے سینئر پروفیسر، ڈاکٹر جم نکولس کر رہے تھے۔ جو بیروت یونیورسٹی میں اپنی پانچ سالہ خدمات پوری کر کے ایک سال ہوا وطن واپس آیا تھا۔ [۴۵]

بہت کوشش کے باوجود بھی جب اس کا نام نہ یاد آیا تو اچانک سے جم نکولس کو ہچکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ ہچکیاں آنے پر اسے یاد آیا کہ وہ کہتی تھی کہ ہچکیاں آئیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو یاد کر رہا ہو۔ ماضی کو یاد کرتے کرتے اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا نام حبیبہ تھا۔ یہ ماضی کی یادوں میں گم ہو کر ماضی کو زندہ جاوید صورت میں سامنے پیش کرنا الطاف فاطمہ کا کمال ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں یہ خوبی نظر آتی ہے۔

حبیبہ اپنے ساتھی کے ساتھ بین الاقوامی تبادلے کے سلسلے میں جم نکولس کے بھائی کے گھر مہمان تھی اور حبیبہ کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

ارے یہ بچے، بچیوں کے بین الاقوامی تبادلے۔۔۔۔

جم نکولس دل کھول کر ہنسا تھا۔ ایک لطیفہ ہی ہیں۔ سنا ہے کہ جب امریکی طالب علم بطور مہمان دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں تو کچھ اس قسم کی ہدایتیں دی جاتی ہیں کہ اگر آپ کا مہمان غسل خانے وغیرہ میں زور زور سے الاپنا شروع کر دے تو آپ کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ یہ ان کی عادت میں داخل ہے۔ مگر یہ پاکستانی لڑکیاں۔۔۔ان کے ساتھ اس قسم کی ہدایتیں آتی ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ جدھر جدھر یہ چلا کریں، لوگ پردے تان کے چلا کریں اور یہ کہ اکیلے وکیلے نہ جانے دیا جائے۔ گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا کوئی دوسرا معتبر شخص ساتھ چلا کرے اور نامحرم مرد گھر میں آواز دیئے بغیر داخل نہ ہوں۔[۴۶]

اس کی بھابھی برا مان گئی تھی لیکن جب دونوں لڑکیوں سے اس کا تعارف کروایا گیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ جم نکولس کو آج بھی یاد ہے کہ اس نے بار بار سوال کیا تھا کہ کیا یہ دونوں ایک ملک کی رہنے والی ہیں۔ عذرا گوری چٹی خوش باش تھی اور دوسری دبلی پتلی خاموش تھی۔ جم نکولس کو آج بھی اس کے ساتھ گزارے پل یاد تھے۔ دوپٹے کو سر سے ڈھانک لینا، قہقہہ لگاتے لگاتے خاموش ہو جانا، یہ سارے ماضی کے واقعات اسے یاد آرہے تھے۔ ماضی کے واقعات میں گم اچانک جم نکولس کو سیمینار میں شرکت کا واقعہ یاد آیا۔

سیمینار میری توقع سے زیادہ کامیاب رہا۔ تم لوگ تو ضرورت سے زیادہ تیار تھے۔ جم نے ٹریفک کے اشارے پر گاڑی روکتے ہوئے اپنی دونوں شاگردوں جینفر اور ویرا سے کہا جو اگلی ہی سیٹ پر ایک دوسری سے بالکل جڑی بیٹھیں تھیں۔[۴۷]

جم نکولس کو وہ واقعہ آج بھی یاد ہے جب سیمینار سے واپسی پر دونوں طلبہ اپنے سر کے ساتھ اس کے گھر میں پہنچ گئیں۔ وہاں کافی پکانے اور گوشت کے سینڈوچز تیار کرنے کے لیے پورے کچن پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ برتن پٹخنے اور نل کھولنے بند کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لیکن اتنی کوشش کے باوجود بھی کافی تیار نہ ہوئی۔ لیکن باورچی خانہ الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے برعکس جم نکولس کو وہ واقعہ بھی یاد آیا جب حبیبہ نے کھانا بنایا تھا۔ جم نکولس ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ماضی کے واقعات میں گم تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ تم بھی کچھ پکا سکتی ہو؟

ہاں انگل میں دو چار چیزیں تو یقیناً پکا سکتی ہوں۔

مثلاً

مثلاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے آپ مجھے بتا دیں گے اسی طرح پکا دوں۔

اور اب وہ ظاہر ظہور ہنس دیا تھا اور اچھا اگر میں یہ کہوں کہ مجھے تو سرے سے پکانا آتا ہی نہیں تم اپنا پاکستانی کھانا پکاؤ تو۔ تو پھر تم کیا کیا پکالو گی؟

م میں۔۔۔۔ وہ اٹکی۔۔۔۔ آلو کی سبزی۔ اس نے خود اعتمادی سے کہا۔

اور؟

اور۔۔۔ مٹر پلاؤ بھی۔۔ اس مرتبہ لہجا سٹپٹایا ہوا تھا۔

اور کچھ؟

ہوں۔۔ اس نے سوچا اور بالکل ہی مری ہوئی آواز میں بولی۔ شاید مرغی کا قورمہ بھی پکالوں۔

اچھا تو مرغی کا قورمہ اور مٹر پلاؤ پکاؤ۔[۴۸]

جم نکولس ماضی کی یادوں میں آس پاس سے بیگانہ تھے۔ انھیں اچانک سے یاد آیا کہ وہ معصوم سی لڑکی مشینوں اور پاکستانی سبزیوں کو دیکھ کر کتنی زیادہ حیرت زدہ ہو گئی تھی اور مشینوں کے ذریعے مختلف مصالحے اور چیزیں پیس کر دکھائیں کیونکہ حبیبہ کے گھر والے پتھر کے سل بٹے پر یا لنگری میں مصالحے پیش لیا کرتے تھے۔ کھانا بہت ذائقہ دار تھا اور کچن بھی نفاست اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ جم نکولس کو وہ معصوم سی بہت پسند آئی۔ حبیبہ نے اپنے وہاں آنے کا واقعہ بھی بتایا کہ کس طرح سلیکشن بورڈ کی غلطی سے وہ وہاں آئی۔ ویسے کوئی چانس نہ تھا۔ اپنے گھر کا ماحول اور پھوپھی کے گھر کا ماحول بھی بتایا۔ جم نکولس کو نہ صرف حبیبہ بلکہ اس کے نام کے معنی "وہ جسے چاہا گیا" یاد آتا تھا۔ یاد آنے کے ساتھ ساتھ ماضی کی یادوں سے نکلنا مشکل ہو جاتا تھا۔

الطاف فاطمہ کا ناسٹلجیا ان کے بہت سے افسانوں میں نظر آتا ہے کیونکہ وہ بہت حساس افسانہ نگار ہیں۔ اپنے حال کو دیکھ کر ماضی کی روایات و اقدار یاد آتی ہیں۔ انھیں لگتا ہے کہ ماضی کے راستوں پر جا کر شاید وقت پیچھے مڑ کر دیکھ لے۔ وقت پلٹ جائے، اسی طرح ایک دن وہ یہ سوچتے سوچتے ماضی میں اپنی بچپن کی یادوں میں چلی جاتی ہیں۔ بچپن کے واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

ہاں یہ بڑا چھاڑ سا پھاٹک وہی تو ہے جس کی لوہے کی سلاخوں سے چمٹ کر ہم پہروں جھولا کرتے تھے۔ ٹکٹ بنتے اور بیچے جاتے تھے۔ گارڈ ہری جھنڈی دکھاتا اور سواریاں ریکنگ پر پیر جما کر سلاخوں سے چمٹ کر ریل کی سواری کرتے اور باقی کے لوگ اس کو زور سے باہر کی طرف دھکیل دیتے تھے۔ ہم فرض کر لیتے کہ گاڑی جنگلوں اور کھیتوں سے گزر رہی ہے۔ جب گاڑی کو اسٹیشن میں داخل کرنا ہوتا تو انگوٹھا ٹھوری کے نیچے اور شہادت کی انگلی ناک کی سیدھ میں ماتھے پر چپکا لیتے اور انگوٹھے اور انگلی کی گھاٹی سے ہونٹ جما کر پوری طاقت سے کھینچ مارتے۔[۴۹]

گرمی کی ساری چھٹیاں یوں ہی گزر جاتیں۔ پولیس ڈاکو کھیل کھیلتے، امرودوں، شہتوتوں کی دکانیں لگاتے۔ ٹیچر اسٹوڈنٹ کے کھیل کھیلتے۔ لیکن انھیں وہ واقعہ آج بھی یاد ہے جب ٹیچر پڑھاتی کچھ نہیں تھیں اور روز سبق سنتی۔ کسی کو نہ آتا تھا اور ٹیچر غصے سے چلی جاتیں۔ انھوں نے گھر آکر والدہ کو شکایت بھی لگائی تھی کہ وہ خود تو پڑھاتی نہیں ہیں۔ کہتی ہیں کہ گھر سے سیکھ کر لاؤ۔ تب اماں نے ربی دت سے پڑھنے کا مشورہ دیا۔ انھیں آج بھی یاد تھا کہ ربی دت نے پڑھانے سے پہلے کچھ شرائط بیان کیں کہ چٹیا نہیں کھینچو گے؟ جھولا جھولنے دو گے؟ بیس جھونٹے دو گی؟ گوشت روٹی کھلاؤ گے۔ ماں تو گوشت کھلانے پر سخت غصہ ہوئی مگر مجبوراً اسے گوشت کھلانا پڑتا۔

> اور ان کی تشریف آتی تو گھس کر پلنگ یا تخت کے نیچے بیٹھ جاتے پھر گھسیٹ گھساٹ کر نکالتی تو بڑے رعب سے فرماتے، پڑھو چھوٹا آ، بڑا او، ای۔ سارے تصویروں والے ورق دل لگا کر پڑھا دیئے۔
> پھر ایک دن پڑھایا۔ موہن اچھا لڑکا ہے، بھور بھئے جاگتا ہے اور اشنان کرتا ہے۔ بھئی مجھے یقین نہ آیا کہ اتنے اجنبی حرفوں میں سے اتنے مانوس بول نکل سکتے ہیں۔
> کم بخت گدھا پڑھاتا نہیں ٹھیک سے۔
> پڑھائے تو رہے ہیں اور کا تمرا سر پڑھائیں؟ [۵۰]

انھیں ہمیشہ یہ الجھن رہی کہ جو بات اردو میں ہے وہی بات ان عجیب حرفوں میں بھی ہے۔ انھیں ایسے سکول میں جانا پسند نہیں تھا جہاں جھگڑا ہو۔ اس طرح ان کا ربی دت سے استادنی شاگردی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ انھیں ہمیشہ برکھارت آتے ہی ربی دت کا خیال آتا تھا۔ خیال آتے ہی ناسٹلجیا میں چلی جاتی کہ ان کا گھر، گھٹاؤں کا جھوم کر آنا، جھڑی لگ کر پانی برسنا، اولیتوں سے پانی کے شراٹے چلنا، لوگوں کا سلونو منانا۔ ان تمام واقعات کے یاد آنے سے وہ ناسٹلجیا میں گم ہو جاتی۔ انھیں وہ واقعہ آج بھی یاد ہے جیسے یہ کبھی بھی نہیں بھول سکتیں۔

> اماں نے ہم لوگوں کو تمھارے لیے راکھیاں منگا کر دیں اور پھر جو تم دروازے کے پیچھے آکر چھپے تو پکڑ کر تمھارے ہاتھ میں وہ لال سبز ڈوروں اور پھندنوں والی راکھیاں باندھ دی گئیں۔ اپنے ہاتھوں میں تین تین راکھیاں دیکھ کر تم خوشی کے مارے گھر بھاگ گئے اور اس سفید شام جھاگ سی دھوتی، لیس والا کرتہ اور گاندھی کیپ لگائے پیتل کے تھال میں چاول، اندرسے اور کیلوں کے ساتھ آٹھ دس آنے پیسے رکھے۔ تم آئے اور اسی دروازے کی آڑ سے ہاتھ بڑھا کر تھال رکھ دیا اور بولے "یہ تمھاری وچھنا ہے۔" [۵۱]

ماضی کی یادوں میں گم انھیں یہ بھی یاد ہے کہ ہر سال ربی دت راکھیاں باندھنے کا کہتا۔ جھولے پر لڑ لڑ کر بیٹھتا لیکن جھولے آہستہ لیتا کیونکہ اسے ڈر لگتا تھا۔ انھیں آج بھی میلا والا واقعہ یاد ہے کہ جب ان کے گھر میلاد تھا اور ربی

دت نے میلاد پر آنے کے لیے بہت جھگڑا کیا اور گھر والوں کو منا کر ہی دم لیا۔ محفل میں سب سے آگے آگے تھے۔ سب کاموں میں حصہ لیا۔ پال بانٹنے، عطر لگاتے، گلاب پاس سے گلاب چھڑکتے اور بچپن میں کہانیاں سنتے وقت وہ بھی لحاف میں دبک کر بیٹھ جاتا۔

الطاف فاطمہ کے ہاں ہجرت کا دکھ نظر آتا ہے۔ ہجرت کرنے سے ان کا بچپن، بچپن کے دوست اور سب یادیں بکھر گئیں۔ ہجرت کے بعد یہ پاکستان آ گئے اور وہ وہیں موجود ہے۔ لیکن جب بھی ساون کا موسم آتا ہے۔ الطاف فاطمہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔ انھیں ربی دت شدت سے یاد آتا ہے اور یہ سوچتی ہیں کہ اس کے ہاتھ راکھیوں سے بھرے ہوں گے۔ انھیں دکھ ہے کہ ماضی میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن آج زمانہ ختم ہونے کے ساتھ انسان بڑی باتوں کے متعلق سوچتا ہے۔ چھوٹی اور گھٹیا سوچوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ اچانک ان کے دل میں شدت سے خواہش جاگتی ہے کہ وہ چپکے سے ربی دت کے پاس پہنچے جہاں وہ معتبر بنے بیٹھے ہوں۔ پیچھے سے ایک ٹیپ لگا کر پوچھیں۔ راکھی بندھوانا ہے۔ وچھنا کا تھال کون سا ہے لیکن یہ مشکل ہے اور یہ درد جا بجا ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔

"بازگشت" افسانے میں بھی ماضی کی گہری یادیں نظر آتی تھیں۔ اخبار پڑھتے ہوئے جب اچانک الجزائر کی جمیلہ کی تصویر دیکھتی ہیں تو اپنی تابندہ یاد آ جاتی ہے نہ صرف تابندہ بلکہ اس کے ساتھ گزارے پل لمحے یاد آ جاتے ہیں۔ سکول اور کالج میں سب لڑکیاں تابندہ کو پسند کرتی تھیں لیکن وقت اور حالات نے اسے مجبور کر دیا۔ اس کا گلا گھونٹ دیا۔ آج بھی اسے وہ واقعات یاد ہیں جب وہ کالج میں تقریر کیا کرتی تھیں اور سب اس کے گن گایا کرتے تھے۔ سینما جاتی تھی، فر فر انگریزی بولتی تھی اور کوئی اردو میں بات کرے تو ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بتایا کرتی کہ مجھے اردو نہیں آتی۔ لیکن اس کی ماں نے اسے سمجھایا کہ جس سے والدین کہیں اس سے ملو، جہاں کہیں وہیں جاؤ۔ یوں زبردستی اس کی شادی کروا کر اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا دیا گیا۔ تابندہ کو سوچ کر اب حال میں اسے لگتا ہے کہ اب یہ جانی پہچانی شخصیت کبھی نہ ابھرے گی۔

"شہپر" افسانے کی مرکزی کردار جہاں آراء جب ہنی مون کے لیے جہاز پر بیٹھی تو سفر شروع کرتے ہی وہ ماضی کی یادوں میں گم ہو گئی۔ کیونکہ پہلے وہ جہاز میں ایئر ہوسٹس کا کام کرتی تھی۔ اپنی ڈیوٹی دیتی تھی لیکن آج وہ اس جہاں آراء سے بہت مختلف ہے۔ اچانک سے اسے اپنی ہوسٹل کی پہلی رات کے تمام واقعات آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

وہ بھی اکتوبر کی نرم اور خشک رات تھی۔ جس کو ہوسٹل کی اصطلاح میں انٹروڈکشن نائٹ کہا جاتا ہے
یعنی وہ رات جس میں بستی بستی اور نگر نگر سے آنے والی لڑکیوں کا تعارف کروایا گیا تھا۔ روشنوں اور

قہقہوں کے درمیان نت نئی لڑکیوں کو زبردستی اٹھا کر ان کو اپنا تعارف کروانے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ [۵۲]

اس کے تعارف کے بعد جہاں آراء کو تعارف کا واقعہ یاد آگیا۔ یہ اس وقت بہت نازک اور شرمیلی سی تھی۔ اس کا نام پوچھنے کے بعد اس سے گانا سننے کی فرمائش کی گئی۔ گلا خراب ہونے کا بہانہ کرنے کے باوجود انھوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اپنے کمرے میں جانے کے بعد کھڑکی سے عجیب سی جانی پہچانی خوشبو آئی جو اسے گھر اور اس کی یادوں کے قریب لے گئی۔ ہوسٹل میں بھی اسے لگا کہ جسے وہ اپنے ماضی میں چلی گئی ہو۔ اپنے گھر میں ماں بہنوں کے ساتھ ہو۔ اسکول جانے کے واقعات بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل سب نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ ایئر ہوسٹس کا یونی فارم دیکھ کر اپنا یونی فارم یاد آگیا۔

الطاف فاطمہ کے اس افسانے میں جہاں آراء سفر کے دوران مکمل ماضی میں گم رہتی ہیں۔ ان کا ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ اچانک سے اسے اپنے گھر کی چبوتری بھی یاد آئی۔ کس طرح وہ اس چبوتری پر بیٹھ کر سکول جانے سے پہلے دودھ پیتی تھی۔ ماں کی نصیحتیں، ڈانٹ، باپ کا پیار یاد آنے پر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آج کی جہاں آراء کل کی جہاں آراء سے کتنی مختلف ہے۔ وہ اپنے حال اور ماضی کا تقابل کرتی رہتی ہے۔ حال میں تمام آسائشات ہونے کے باوجود ماضی بہت خوب صورت اور پرکشش نظر آتا ہے اور وہ پر لگا کر ماضی میں دوبارہ جانا چاہتی ہے۔

ماضی کے تمام واقعات یکے بعد دیگرے سادے یاد آرہے تھے۔ سب سے اہم وہ واقعہ جسے فرینڈ شپ ویک کہا جاتا۔ اس کھیل میں قرعہ اندازی کی جاتی اور ان پر لڑکیوں کے نام لکھے جاتے اور سب کو پرچیاں دی جاتیں اور وہ نام صیغۂ راز میں رکھے جاتے۔ ان پرچیوں میں جو نام ہوتے انھیں تحائف دیئے جاتے۔ تمام ہفتے سب کو تحفے ملتے رہتے۔

> ایک صبح جہاں آراء کو اپنی میز پر شینل جیسے قیمتی سینٹ کی شیشی رکھی ہوئی ملی تھی اور وہ اس کی صحیح قیمت کا اندازہ بھی نہ لگا پائی۔ البتہ خوشبو اگلی اور پچھلی تمام خوشبوؤں سے زیادہ لطیف اور مست کن تھی اور اسی دوپہر تو شہناز لطیف نے "کوری ڈور" میں کھڑے ہو کر دہائی دی۔ "ارے بھئی وہ میری نامعلوم دوست کدھر سوئی ہوئی ہے۔ کچھ اس کو خبر بھی ہے کہ مایہ ولت کی روشنائی مکھ ہو گئی ہے۔ [۵۳]

جہاں آراء کو آج بھی یاد ہے کہ جب وہ روشنائی رکھنے گئی تھی تو اس نے سوچا کہ ان دونوں کی دوستی کا بھی کوئی جوڑ ہے۔ وہ عنابی پردوں کا فوری قالین اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ کمرے میں تھی۔ کمرے میں موجود تمام اشیاء قیمتی تھیں۔ اس رات جہاں آراء یہی سوچتی رہی کہ امیر لڑکیوں کو یہاں داخلہ ہی کیوں ملتا ہے۔ جب وہ ایک جیسا رہن سہن نہیں اپنا سکتی۔ اس وقت ہی اس کا دل دوستی سے کھٹا ہو گیا۔ لیکن رخشندہ کو جہاں آراء بہت پسند آئی۔

جہاں آراء کو آج بھی وہ واقعہ یاد ہے جب اس نے ویلکم پارٹی کے لیے ابا جی سے پیسوں کا مطالبہ کیا تھا لیکن ابا

جی کے پاس موجود نہیں تھے۔ اچانک ہی آسمان پر نظر اٹھتے ہی تاروں کو دیکھ کر انھیں یاد آیا کہ ان کے ابا جی عشاء کی نماز ختم کر کے بلند آواز میں درود پڑھ رہے ہوں گے۔ رخشندہ کا بھائی سلیمان اسے پسند کرتا تھا۔ لیکن اس کے گھر والے نہیں مان رہے تھے اور ابا جی نے جہاں آراء کو پڑھائی بند کرنے کو کہا۔ اس کے بعد اسے انٹرویو کے بعد ائیر ہوسٹس کی نوکری مل گئی۔ ہر ہفتے نئے ملک کا چکر لگاتی۔

جہاں آراء کو جہاں جارج نے پسند کر لیا۔ یہ سید زادی تھی اس لیے اسے مسلمان ہونے کی شرط رکھی۔ شرط مان لی گئی۔ اس طرح اس کی شادی ہو گئی۔ لیکن اسے نہ صرف ہوسٹل بلکہ اپنے گھر میں گزارے تمام پل یاد آ رہے تھے۔

"سلور کنگ" افسانے میں بھی ناسٹلجیا موجود ہے۔ سلور کنگ بھی ماضی کی یادوں میں گم ہو کر گزرے ہوئے لمحوں اور بیتے دنوں میں جا پہنچتا ہے۔ جب وہ انگریزوں کی نوکری کرتا تھا۔ شراب سرو کرتا، موسیقی سے لطف اندوز ہوتا اور صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور واقعات آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ کس طرح چاندی کی پلیٹ میں بل لگا کر پیش کرنا، ایک انداز سے بٹوہ نکال کر بل ادا کرنا، میم کے ساتھ ساتھ شملے کے مناظر، سلور کنگ کو افسوس ہے کہ اس سے ایسا کیا گناہ ہوا ہے جو آج وہ ماضی سے اتنا دور ہے۔ وہ اس دور میں دوبارہ جانا چاہتا ہے۔

سلور کنگ کو آج بھی وہ واقعہ یاد ہے کہ انگریز ہمیشہ دیسی لوگوں کو ٹیٹو کہہ کر پکارتے تھے اور سلور کنگ کو سینٹو لوگوں سے سخت نفرت تھی۔ ان کا آرڈر لینا تو دور کی بات کبھی ان کو چائے تک پیش نہ کی اور آج وہ ان نیٹو صاحب کی نوکری کرتا ہے اور ان کی چھوڑی ہوئی ٹپ بھی نہیں رکھتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تنگ دستی اور فاقہ مستی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح صاحب کی نوکری کرنا چاہتا ہے مگر ماضی میں جانا اس کا خواب خواب ہی رہا۔

"گواہی" افسانے کا مرکزی کردار حال میں جی رہا ہے لیکن جب اچانک سے کچھ چیزیں دیکھتا ہے تو ماضی کے کچھ واقعات ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ ماضی کے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے لگتے ہیں۔ کوسی جو ہمیشہ برف باری میں لالٹین لے کر اس راستے پر کھڑی ہو جاتی تھی کہ اس کی ماں رات میں راستہ نہ بھٹک جائے۔ عید والے دن اسے شک تھا کہ آج عید نہیں ہے کیونکہ ماضی کی گزاری گئی عید آج کے دن سے بہت مختلف ہے۔ پہلے سب عید کی تیاری کرتے، سویاں، شیر خرما تیار کیا جاتا، عید کے کپڑے لیے جاتے۔ بچوں کے لیے چوڑیاں مہندی لی جاتی۔ لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ شیر خرما تیار کیا گیا اور مرد حضرات نماز عید پڑھنے گئے ہیں۔ اس بات کی گواہی چاہیے کہ عید منائیں یا نہ منائیں۔ لیکن گواہی کون دے۔

"ٹڈی چٹا سویٹر" افسانے کی مکمل کہانی سویٹر کی بیان کی گئی ہے۔ افسانے کی مرکزی کردار جس نے وہ سویٹر

ہمیشہ پہنا ہے۔ اس سویٹر نے اس کا ساتھ دیا ہے۔ سویٹر کے بارے میں جب مسرور میاں اسے کہتے ہیں کہ یہ تبدیل کر لو۔ اب یہ پرانا ہو گیا ہے تو انھیں مسرور میاں کا ماضی یاد آتا ہے کہ سویٹر کی طرح ان کا بھی کچھ ماضی تھا۔ وہ بھی تو اب بدل گئے ہیں اور شادی کے واقعات بھی یاد آ رہے تھے۔

> ان دنوں سیالکوٹ میں ان کا چہرہ شفاف اور مسکراتا ہوا کرتا تھا۔۔۔۔ وہاں ہم سب شادی کے گھر میں جمع تھے۔
>
> آتش دانوں میں موٹے موٹے لکڑوں کی آگ روشن تھی۔ بڑی اور لمبی میز پر یہاں سے وہاں تک کھانے چنے تھے، چوکولیٹ رنگ کے سویلین سوٹ میں مسرور میاں کا چہرہ ہنس رہا تھا اور انھوں نے اپنی پلیٹ میں مرغی اور بریانی بار بار ڈالی تھی۔
>
> یہ ان دنوں کی بات تھی جب سیالکوٹ فقط اقبال کا شہر تھا۔ [۵۴]

مسرور میاں کا چہرہ تو بدل سکتا ہے لیکن اس کا سویٹر نہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے سویٹر کا مختلف چیزوں سے موازنہ کرتی ہے کہ وہ چیزیں تو بدل سکتی ہیں لیکن سویٹر نہیں۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں موجود ہے۔ حال کے واقعات سے ماضی کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ ماضی اس طرح سے بیان کرتی ہیں کہ وہ توانا حوالہ بن کر ابھرنے لگتا ہے۔ وقت گزرنے کے باجود بھی ماضی زندہ ہے۔ ماضی کو یاد کر کے وہ مانوس افسردہ نہیں ہوتی بلکہ رجائیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ انھیں ماضی سے محبت ہے۔ ماضی میں دوبارہ لوٹ جانے کی خواہش بار بار نظر آتی ہے۔ افسانہ "سلور کنگ" کا مرکزی کردار اپنے اندر ماضی کو سموئے ہوئے نظر آتا ہے۔ اس کے پاس برطانوی راج کی یادیں ہیں۔ ماضی ورق ورق ہو کر اس کے سامنے چلتا رہتا ہے۔

"جشنے دارد" افسانے میں الطاف فاطمہ کا اپنا ناسٹلجیا موجود ہے۔ ٹربائن کے پھٹنے سے وہ ماضی کے واقعات کی طرف مراجعت کر جاتی ہیں۔ کس طرح پہلے سب اکٹھے رہتے تھے۔ محلے والوں کیا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں۔ "مشت غبار" افسانے میں بھی انیکسی میں رہتے ہوئے بلند دیواروں میں دوسرے انسانوں سے بہت دور ہو گیا ہے۔ ماضی کو فخریہ انداز میں پیش کرتی ہیں۔ افسانہ "مچھلی" میں بھی دونوں مرکزی کردار ایک دوسرے کو دیکھ کر ماضی کے واقعات میں گم ہو جاتے ہیں۔ کالج کا زمانہ یاد آتا ہے۔

"شیر دھان" افسانے میں الطاف فاطمہ نے دورِ حال کا سب سے بڑا المیہ بیان کیا ہے کہ ماضی میں سب کتابیں پڑھنا پسند کرتے تھے۔ بچہ بچہ کتاب پڑھتا تھا لیکن آج جدید انٹرنیٹ کی دنیا ہے۔ کسی کا کتاب سے کوئی واسطہ نہیں۔ کتاب خریدنا اور پڑھنا ایک زمانے میں طالب علموں کی سب سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے افراد کا

رشتہ تہذیب سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج کتابوں سے دور ہونے کی وجہ سے انسان تہذیب سے بھی دور ہو گیا ہے۔ آج کا فرد آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ مشینی عہد کے آغاز کے ساتھ جہاں پرانی قدروں کی شکست و ریخت شروع ہو گئی وہیں ماضی اپنی اہمیت کھونے لگا۔ پرانے زمانے کے انسان سے اس کی شناخت چھین لی گئی۔ فرد خود کو نئے سماجی ثقافتوں کے مطابق ڈھالنے لگا۔

الطاف فاطمہ کے ہاں حال کے تہذیبی رویوں سے بغاوت اور ماضی کی روایات، اقدار سے لگاؤ کا احساس ملتا ہے۔ ایک خاص قسم کی انسیت کا تاثر ابھرتا ہے۔ موجودہ زمانے کی سماجی اقدار اور ان سے وابستہ رویوں میں شدید گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ الطاف فاطمہ کا غمِ زندگی سے فرار نہیں کیونکہ اس میں ایک مخصوص قسم کا اخلاقی اثر موجود ہے۔ ماضی کو خوب صورت انداز میں پیش کر کے ان کی روایات سے محبت اور عزت کرنے کو دل کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مصنوعی اور بناوٹی انداز نظر نہیں آتا کیونکہ وہ اپنے گرد و پیش سے حقیقی واقعات پیش کرتی ہیں۔ اس لیے ان کا انداز بیان سچا لگتا ہے۔

الطاف فاطمہ کے اکثر افسانوں میں درد کی کسک اور چبھن پڑھنے والوں کو ماضی کی یادوں کے ان حسین ادوار میں لے جاتی ہیں۔ جہاں انھوں نے اپنا خوب صورت بچپن گزارا ہوتا ہے۔ "شہپر" افسانے کی مرکزی کردار "جہاں آراء" سفر کے دوران اپنے بچپن کے واقعات، والدین کی یادیں اور ہوسٹل کی بے شمار یادیں بیان کرتی ہیں اور انھیں سوچ کر خوشی ملتی ہے۔

الطاف فاطمہ نے افسانوں میں ماضی کی یادوں کے ساتھ ساتھ ہجرت کے دکھ کو بیان کیا ہے۔ افسانے میں انھوں نے بچپن، سکول کی یادیں، ربی دت کے ساتھ گزارا گیا بچپن، اسے راکھی باندھنا، مل کر جھولے لینا سب بیان کرتی ہے۔ ماضی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے وہ خواہش کرتی ہے کہ کاش وہ دوبارہ سے ماضی جا کر ہندوستانی دوست، بھائی، ہمسائے ربی دت سے ملاقات کریں اور ان سے پوچھیں کہ اب بھی راکھی بندھوانی ہے اور اب وہ کتنا سمجھ دار ہو گیا ہو۔

الطاف فاطمہ ماضی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے نیم کی چھاؤں میں بنی ہوئی چبوتری، ہر صبح شام مٹی کی انگیٹھی میں سلگتے ہوئے ایلوں پر جوش کھاتے ہوئے دودھ کی خوشبو پھیل جانا، سب کا مل جل کر کھیلنے جانا اور لڑ لڑ کر جھولے لینا، اسکول جانے سے پہلے اسی چبوتری پر بیٹھ کر گلاس میں اجلا اجلا گرم بالائی ملا دودھ ڈال کر پھونکیں مار کر پینا، کسی کسی چٹیا باندھنا، بستہ اٹھائے موٹی ململ کا دوپٹہ لیے اسکول جانا۔ ان سب یادوں کو ناسٹلجیا کو بیان کرتے ہوئے ماضی میں مکمل طور پر کھو جاتی ہیں۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا جابجا نظر آتا ہے۔ ہر واقعہ دوسرے واقعے سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ تمام واقعات میں سچائی نظر آتی ہے۔ حال میں رہ کر ماضی کے مٹ جانے کا خوف اور پرانی تہذیب و ثقافت سے دوری کا المیہ نظر آتا ہے۔ ان کا افسانہ "ٹڈی چٹا سویٹر" میں سویٹر سے انسیت اور لگاؤ کا انداز نظر آتا ہے۔ انھیں بار بار مشہور دیا جاتا ہے کہ سویٹر چھوڑ دو لیکن یہ سویٹر کا انسانوں سے موازنہ کرتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ فرد کی ظاہری و باطنی حالت میں تبدیلی آتی ہے۔ لیکن سویٹر جوں کا توں ہے۔ دراصل سویٹر سے انسیت انھیں ان کے ماضی سے لگاؤ، محبت کا انداز نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں ماضی زندہ و توانا جوالہ بن کر ابھرتا ہے۔

الطاف فاطمہ کا افسانہ "خستہ خانم" کی مرکزی کردار کی جب اپنے بچپن کے دوست سے اچانک ملاقات ہوتی ہے تو اسے ماضی کے کھیل، کچی امبیاں توڑنا، گھونسلوں سے انڈرے چرانا، غلیلیں بنانا، سکول مل کر جانا سب یاد آتا ہے۔ ماضی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے حال سے ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔ حال کو یکسر فراموش کر دیتی ہیں۔ کبھی کہ ناسٹلجیا کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنے ماضی سے مل لیتے ہیں۔ ماضی کو دوبارہ زندہ جاوید کر سکتے ہیں۔

مجموعی طور پر الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا واقعات کے تناظر میں نظر آتا ہے۔ حال کے منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے ماضی کے ادوار کا جائزہ لیتی ہیں اور ان گزرے ہوئے لمحات سے محبت، چاہت، وفا، لگاؤ اور ہمدردی کا جوہر کشید کر کے دوبارہ زمانہ حال میں محو ہو جاتی ہیں۔ ان کے ہاں ماضی کا حوالہ ایک مثبت قدر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جس پر چل کر چند لمحے سکون سے گزارے جا سکتے ہیں۔ کچھ پل حال کو یکسر فراموش کر کے ماضی میں سانس لیتی ہیں۔ یہ احساس روح کو آسودگی اور طمانیت کے احساس سے دوچار کرتی ہے۔

واقعات کے تناظر میں ناسٹلجیا کا اظہار الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ایک نئی معنویت کو جنم دیتا ہے۔ پڑھنے کو تو یہ واقعات محض وقت کے مختلف حصوں پر پھیلے ہوئے نشان ہیں۔ تاہم الطاف فاطمہ کی ژرف نگاہی ان میں گہرائی کو جنم دیتی ہے۔

مصنفہ نے واقعات کے تناظر میں جہاں ماضی کے تہذیبی رویوں کو بیان کیا ہے وہاں وہ ایک پورے اخلاقی منظر نامے کو ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتی ہیں۔ یہ منظر نامہ، شرم و حیا، ادب و آداب، بھائی چارے، دوستی، محبت و الفت اور باہمی رواداری سے عبارت ہے۔ اس ماحول میں لحاظ اور فرمانبرداری کو گھٹی کے طور پر تربیت کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ بڑوں کے سامنے بات کرنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مصنفہ جہاں اس تناظر کو بیان کر کے حال میں واپس آتی ہیں۔ وہاں ایک گہری افسردگی اور کھو جانے کا احساس ان کے دامن گیر ہو جاتا ہے۔ یہ افسردگی دراصل لاحاصلی کی علامت ہے

کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں ہم خود کو تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ کہلانے لگے ہیں وہیں بنیادی قدریں ہم سے چھین لی گئی ہیں۔

شکستگی کے اس احساس کے ساتھ ساتھ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا کا واقعاتی تناظر مثبت طرزِ فکر کو بھی ابھارتا ہے۔ وہ جب جب ماضی کے موسموں، رنگوں اور گلی کوچوں کا حوالہ دیتی ہیں۔ ایک خوشگوار اور طمانیت کا احساس قاری کے دامن گیر ہوتا ہے۔ یہ احساس در حقیقت ان واقعات اور ان میں چھپی مثبت توانائی کو از سرِ نو زندہ کرتا ہے۔ واقعاتی بیان کے تناظر میں الطاف فاطمہ کے ہاں ناسٹلجیائی فکر دراصل حال میں رہتے ہوئے ماضی سے جڑے رہنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہ طرزِ فکر ان کے ہاں مثبت قدروں کو اجاگر کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ماضی کے خوشگوار واقعات اور تجربات سے قوت اور توانائی حاصل کر کے اپنے موجودہ حال کو ہمیشہ سے بہتر بنانے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ روبینہ شہناز، اقلیمہ ناز۔ "الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کے عناصر" مشمولہ خیابان۔ تحقیقی مجلہ (پشاور: جامع پشاور، شمارہ ۲۰۱۴ء)، ص ۹۳۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں (کراچی: دی سمیع پرنٹرز، ۲۰۰۳ء)، ص۔

۴۔ ایضاً، ص ۹۔

۵۔ ایضاً، ص ۹۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۷۔ روبینہ شہناز، اقلیمہ ناز، "الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کے عناصر" مشمولہ خیابان، ص ۹۴۔

۸۔ الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، ص ۱۱۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۱۱۔

۱۲۔ الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، ص ۲۵۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص۔

۱۶۔ ایضاً، ص۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۷۹۔

۲۱۔ روبینہ شہناز، اقلیمہ ناز، "الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کے عناصر" مشمولہ خیابان، ص۔

۲۲۔ الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں، ص۹۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص۹۹۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۰۵۔

۲۶۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص۱۳۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص۱۲۹۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۳۵۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۳۱۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص۱۶۲۔

۳۳۔ الطاف فاطمہ، تار عنکبوت (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء)، ص۷۔

۳۴۔ ایضاً، ص۳۳۔

۳۵۔ ایضاً، ص۳۴۔

۳۶۔ ایضاً، ص۳۸۔

۳۷۔ ایضاً، ص۴۲۔

۳۸۔ ایضاً، ص۴۳۔

۳۹۔ ایضاً، ص۶۸۔

۴۰۔ ایضاً، ص۶۸۔

۴۱۔ ایضاً، ص۸۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص۹۷۔

۴۳۔ ایضاً، ص۱۱۷۔

۴۴۔ ایضاً، ص۱۳۸۔

۴۵۔ الطاف فاطمہ، وہ جسے چاہا گیا (لاہور: دی مکتبہ اردو ڈائجسٹ)، ص۳۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۴۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۷۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۰۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۴۱۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۴۶۔

باب چہارم:

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا:
کرداروں کے تناظر میں

باب چہارم:

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیا: کرداروں کے تناظر میں

ہر زمانے میں رہنے والے لوگوں کا اپنا طرزِ فکر اور نظریۂ حیات ہوتا ہے اور یہ کہ سب اس دور کے رہنے والے افراد ترتیب دیتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ یہی افراد دراصل کسی بھی سماج یا مانے کے بنیادی کردار ہوتے ہیں اور سماج کی تعمیر و تشکیل میں اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ ان کرداروں کی انسانی وجود کی اہمیت ہر دور میں بنیادی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اردو ادب میں کردار نگاری بہت بڑا حوالہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اسی کے ذریعے کسی بھی معاشرے کی سوچ اور طرزِ فکر کا اظہار کر سکتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں بھی کرداروں کی پیش کش کو مختلف اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں کا بنیادی موضوع ناسٹلجیا ہے۔ ناسٹلجیا سے مراد ماضی ہمارا گزرا ہوا زمانہ ہے۔ وہ حال اور ماضی کا تقابل کرتی ہیں۔ ماضی زیادہ حسین اور خوب صورت لگتا ہے۔ وہاں وہ تہذیبی روایات اور قدریں نظر آتی ہیں جو آج کے دور میں ناپید ہیں۔ انھیں ماضی عزیز ترین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مستقبل کی فکر کم اور ماضی کا ذکر زیادہ کرتی ہیں۔ انھیں اپنے ہر گزرے ہوئے پل کی یاد بے چین رکھتی ہے۔ ماضی کی دل نشین یادیں اس کے لیے ایک انمول خزانہ ہوتی ہیں۔ بزرگوں کی بڑی عزت تھی۔ ایک دوسرے کی عزت کی جاتی تھی۔ بچے اور نوجوان بزرگوں سے خوف کھاتے تھے۔ محلے میں سب محبت سے مل کر رہتے اور ایک دوسرے کے حال سے واقف رہتے تھے۔ وہ بڑا ہی اچھا وقت تھا۔ خالص لوگ، خالص اشیاء اور خالص محبت پھر ہماری ترقی کرنے سے سب کچھ بدل گیا۔ دولت اور ترقی کی ہوس نے سب تہذیبی قدروں کو ختم کر دیا۔ الطاف فاطمہ کو اسی بات کا دکھ ہے۔ اسی لیے حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔ ماضی سے ایک خاص قسم کی انسیت کا تاثر ابھرتا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں ناسٹلجیا کرداروں کے تناظر میں نظر آتا ہے۔

"مہرہ جو پٹ گیا" افسانے کا مرکزی کردار سکندر بخت جس کا حال اور ماضی بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جب بھی بال کٹوانے باربر کے پاس جاتا تو اسے ہمیشہ سکندر بخت یاد آتا تھا کیونکہ وہ بہت نفاست سے بال کاٹتا تھا اور بال کاٹتے کاٹتے اچھی اچھی باتیں بھی کرتا تھا۔ اس زمانے میں بالوں کو صرف نفاست سے کٹوایا جاتا تھا۔ سب سکندر بخت کے پاس بال کٹوانے جاتے تھے لیکن آج حال میں سب کو جدید اور نئے انداز سے اپنے بال کٹوانے ہیں۔ اس لیے

آج کوئی بھی سکندر بخت سے بال کٹوانا پسند نہیں کرتا۔ پہلے سب اصل نسلی اور خاندانی قسم کے خاص تراش سے بال کٹواتے تھے لیکن آج کوئی بھی حجام ہو۔ لیکن جدید انداز کے بال کاٹتا ہو۔ بچے اسی سے بال کٹوانا پسند کرتے ہیں۔

سکندر بخت کے آنے کے اوقات مقرر رہے تھے اور سب اس کا انتظار کرتے تھے۔ وقت کی پابندی کو وہ زندگی کا لازمی جزو سمجھتا تھا۔

> اس کی آمد کے اوقات اس کے خاص گاہکوں کو اچھی طرح یاد تھے۔ لاؤنج کے سیاہ چرمی صوفے، کرسیاں اور سارے اسٹول بھر جاتے۔ سائیڈ ٹیبلوں پر میگزین اور رسالے سجے ہوتے۔ سب اس کی فراغت اور اپنی باری کے انتظار میں پائپ یا سگار پی رہے ہوتے۔ لیڈیز اگرچہ اکثر ہی ہوتیں مگر کیا مجال جو اپنی باری کے سوا آگے آنے کی کوشش کرتیں۔ پتہ تھا سکندر بخت کا ڈسپلن بڑا سخت ہے وہ سہج سہج اور منظم طریقے سے کام کرنے کا عادی تھا۔ پہلے آؤ، پہلے خدمت حاصل کرو اس کا موقف تھا۔[1]

اس افسانے کا مرکزی کردار ہمیشہ سکندر بخت سے بال کٹواتا تھا اور اس پورے افسانے میں وہ سکندر بخت کی یادوں میں گم ہے۔ جب وہ بال کٹوانے گیا تو سکندر بخت نے ہی اس کے بال کاٹے تھے مگر پیسے نہیں لیے تھے کیونکہ اس کے پاس دینے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس دن سے اسے سکندر بخت سے لگاؤ ہو گیا تھا اور اپنے بیٹے کے بال کٹوانے بھی سکندر بخت کے پاس گیا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ آج کوئی بھی اس نسلی اور خاندانی باربر سے بال کٹوانا پسند نہیں کرتے اور اسے کوئی پہچانتا تک نہیں۔ میرے بیٹے بلونے بھی ڈسکو دیوانے سے بال کٹوانے کی ضد کی تو سکندر بخت نے کہا یہ بچے کی نہیں وقت کی آواز ہے۔ وقت نے سب بدل دیا ہے۔ حال اور ماضی میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ ماضی کی روایات حال کے ساتھ بدل گئی ہیں۔ اس افسانے میں کرداروں کی زبان، طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ کرداروں کے مزاج میں واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔

"کنڈکٹر" افسانے میں لالو کا کردار منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ لالو کا کردار ماضی اور حال کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ لالو کے بارے میں جب بھی کوئی خبر ملتی اس کے ماضی اور حال کے تقابل کو بیان کیا گیا ہے۔ آج جب لالو کے بارے میں خبر ملی کہ کراچی میں بنگلہ بنانے کے ساتھ ساتھ اچھا بزنس جما لیا ہے۔ ایک سکول ٹیچر سے شادی کر لی ہے تو اس کا ماضی کا کردار یاد آتا ہے کہ وہ ماضی میں سادہ سا عام سا انسان تھا۔ پڑھائی میں ذرا دھیان نہیں دیتا تھا۔ تتلاہٹ بھی بہت زیادہ تھا اور آج کراچی میں ایک بہت بڑا بزنس چلا رہا ہے۔ اس کا پڑھائی سے زیادہ زندگی اور دھرتی کے رنگوں سے رابطہ رہتا۔ اسے ہمیشہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پر کالی ٹانگوں اور سفید پروں والے بگلوں کی قطار میں آج کتنے بگلے تھے۔ آنگن میں کتنی اور کس کس طرح کی چڑیاں ہوتیں لیکن آج کے دور میں کسی کے پاس بھی وقت نہیں

ہے۔ وقت کی دوڑ میں سب آگے بھاگے چلے جارہے ہیں۔ کسی کو بھی قدرت میں دلچسپی نہیں رہی۔

جب بھی پاکستان بننے کی صدائیں سنائی دیتیں۔ ہمیشہ لالو کا کردار یاد آتا۔ کیونکہ اسے سکول جانے سے زیادہ مسلم لیگ میں دلچسپی تھی۔ ایک دن تو مکمل اپنے بھائی کے ساتھ غائب رہا۔ اس دور میں سب کی زندگی ایک جیسی ہوتی تھی۔ سب کی خوشیاں اور غم ایک جیسے ہوتے تھے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی ہوتی۔ ایک کا غم دوسرے کا غم۔ لیکن آج کے دور میں کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ سب خود میں مگن ہیں۔ اپنی ترقی کی راہ میں دوسرے کو رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

لالو کی والدہ ہمیشہ ماسٹر صاحب کو عزت دیتی اور انھیں مکمل اجازت تھی کہ وہ بچوں کو مار سکتے تھے۔ تہذیبی روایات، قدروں سے محبت کی جاتی تھی۔ بڑوں کا خوف ہوتا تھا لیکن آج اساتذہ کو ڈرایا سمجھایا جاتا ہے۔ اساتذہ کو وہ عزت نہیں دی جاتی جو پہلے دی جاتی تھی۔

> ماسٹر صاحب! آپ کو خدا کی قسم! انھیں اتنا ماریئے کہ ان کی ساری لیڈری ناک سے نکل جائے۔ ان کی جان نکل جائے۔۔۔۔
>
> مجھے کبھی نہ بھولے گا، ماسٹر صاحب نے دونوں کو لٹالٹا کر مارا اور ہم سب کو حکم دیا۔ "چلو کم بختو، اپنی کتابیں نکالو۔"[۲]

الطاف فاطمہ افسانوں میں ماضی کو بیان کرتے ہوئے اپنی خواہشات کا اظہار مرکزی کردار کے ذریعے کرتی ہیں۔ انھیں پرانی تہذیب و ثقافت، اقدار، رویوں، طرزِ فکر سے محبت تھی۔ ماضی میں دوبارہ لوٹ کر ان قدروں کو زندہ کرنا چاہتی ہیں۔ تارِ عنکبوت افسانے کا مرکزی کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ جب اس کی ماں ہر جمعے کو گھر کی صفائی کیا کرتی تھیں اور خاص طور پر مکڑی کے جالے اتارا کرتی تھیں۔ بانس سے جالا اتارتی اور پورے گھر میں ملازم کے ساتھ شور مچایا کرتی۔ لیکن آج کے دور میں سب کام ملازم ہی کرتے ہیں۔ خواتین کے رہن سہن میں واضح تبدیلی آگئی ہے۔ گھریلو کاموں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف خود میں گم گھر سے لینا دینا نہیں اور پہلے خواتین اپنی موجودگی میں ملازم سے کام کرواتی تھیں۔

اس افسانے کے مرکزی کردار کے اندر یہ خواہش شدت سے جنم لیتی ہے۔ وہ بھی کہیں مکڑی کے جالے دیکھے اور اپنی موجودگی میں بانس سے ان جالوں کو اتروائے مگر آج کے گھر کچی مٹی کی دیواروں سے کوٹھیوں میں منتقل ہو گئے ہیں جہاں مکڑی کے جالے ناپید ہو گئے ہیں۔ چھٹی کے روز کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ گھر بھر کی صفائی چھٹی کے روز کی جاتی، کہیں آنا جانا ہوتا، کسی کو بلوانا ہوتا تو چھٹی کے روز کا انتظار کیا جاتا تھا۔

ان کا یہ پروگرام ہمیشہ چھٹی کے روز شروع ہوتا۔ جمعہ کا دن کیا طلوع ہوتا کہ ہفتہ صفائی شروع ہو جاتا۔ دراصل ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد بھی اماں جان کو سارے کام اور ساری صفائیاں جمعہ ہی کے دن نبٹانے کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ پھر وہ آکر اس کے کمرے میں کھڑی ہو جاتیں۔ بس آج چھٹی کا دن بستر ہی میں گزارو گے؟ پوستی نہیں تو۔ چلو نکلو یہاں سے دیکھ تو کمرے میں کتنے جام لنک آئے ہیں۔ تم تو ہوش ہی نہیں لیتے۔[۳]

اس افسانے میں ماضی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کی تہذیب و ثقافت اور روایات کو بیان کیا گیا ہے۔ کس طرح چھٹی والے روز سب مل کر گھر کی صفائی کیا کرتے تھے، مل جل کر رہتے تھے۔ لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے الطاف فاطمہ کو ماضی کے گزر جانے کا دکھ ہے اور یہ دکھ وہ اس مرکزی کردار کے ذریعے بیان کرتی ہیں کہ چھٹی والے روز ملک کر کام کیا جاتا۔ گھر میں کوئی بھی فنکشن ہوتا تو سب مل جاتے، اکٹھے کام کرتے۔ ان تقریبات میں سب اکٹھے ہوا کرتے تھے مگر اس کی بیوی کو اس سب میں دلچسپی نہیں ہے۔ وہ حال میں جی رہی ہیں۔ گھر یا گھر کی صفائی سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں۔ اس کے دل میں تو اس کے رشتہ داروں سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ اکیلے اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس کی مصروفیات الگ الگ ہیں۔ ماضی اور حال کی مصروفیت میں واضح فرق ہے۔ اس کے ہزار بار کہنے کے باوجود بھی وہ کبھی اس کے رشتہ داروں سے ملنے پاکستان نہیں آئی۔ یہاں تک کہ شادی پر بھی وہ آتیں اور ابا میاں کی برسی پر بھی اس کی ہزاروں مصروفیات تھیں۔

ماضی میں شادی کے بعد بچوں کی آمد کا شدت سے انتظار کیا جاتا تھا نئی نویلی دلہن جب امید سے ہوتی تو سب اس کا خیال رکھتے تھے اور بچوں کے نام سوچے جاتے تھے۔ لیکن آج جدید کی عورت بچوں کو پیدا کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف سوچ بدلی بلکہ اپنی تہذیب و ثقافت، روایات کو سب بھول گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے کا یہی المیہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔

میں بچوں کے جھمیلوں میں پڑ جاتی اور ایشیائی عورتوں کی طرح اپنی ریسرچ مکمل نہ کرتی۔ جی ہاں میں سنتھیا ہوں۔ سنتھیا احمد۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی لوگوں کو احمد اور محمد اور حسین اور علی جیسے نام رکھنے کا کریز ہے۔[۴]

اس افسانے کا مرکزی کردار احمد جس کی بیوی جدید دور کی رہنے والی ہے اور آج کے دور کی طرح ہی رہنا چاہتی ہے۔ ماضی سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ ماضی کی روایات کو اپنانے میں شرمندگی محسوس کرتی ہے مگر الطاف فاطمہ نے ماضی کی روایات کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ خود بخود ان روایات کو اپنانے اور تہذیب و ثقافت کو

از سرِ نو زندہ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اولاد کی پیدائش پر دادی، ماں، بھابھی سب اس کا خیال رکھتی ہیں اور بعد میں وہی اولاد اس کی خوشی کا سبب بنتی ہے۔ عید، شادی، بیاہ کے موقع پر سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی عزت کی جاتی ہے لیکن آج عید کے موقع پر بھی شک ہوتا ہے کہ آج عید کا دن ہے بھی یا نہیں۔ ہمارے معاشرے کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنی روایات سے بہت دور جا رہا ہے۔ اپنی تہذیب و ثقافت کو خود ختم کر رہا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار احمد جب اپنے گھر واپس آتا ہے تو تمام مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ کردار ماضی میں گم ہو جاتا ہے۔

> ایک بانس کے سرے پر بہت سا گودڑ بندھوائے جمعدار کے لڑکے کو ساتھ لیے گھر بھر کے جالے صاف کرواتی پھر رہی ہیں۔ لان کی گھاس کٹوا رہی ہیں۔
> کچن میں کھڑی علی حسین کو بچوں کے ناشتے کے بارے میں ہدایات دے رہی ہیں۔
> علی حسین بھی مستعد اور مصروف ہو کر بڑے پُر اعتماد نظر آ رہے ہیں۔ گھر میں ایک رونق اور گہما گہمی کا اکھوا سا جیسے پھوٹ رہا ہے۔ سر اٹھا رہا ہے۔[5]

جدید دور میں بوڑھوں کو اولڈ ہاؤس میں بھجوانا فیشن سمجھا جاتا ہے۔ احمد کی والدہ کو بھی جب اولڈ ہاؤس بھجوانے کی ضد کی گئی تو احمد کا کردار ماضی میں گم ہو کر اس کی تہذیب و ثقافت، روایات، اقدار کو یاد کرتا ہے تو اولڈ ہاؤس بھجوانے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے گھر میں وہی رونق پھر سے نظر آتی ہے۔ اس افسانے میں احمد دوسرے کرداروں میں تہذیبی رویے تلاش کرتا ہے۔ ان کی سوچ، طرزِ فکر میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ کرداروں کی تہذیبی قدروں کا تضاد نظر آتا ہے۔ کرداروں کی سوچ میں واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ سوچنے کا انداز بالکل بدل گیا ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کے ناسٹلجیا کے ذریعے حال اور ماضی کی تہذیبی قدروں اور سوچ کو بیان کیا گیا ہے۔

"ایسی لمی اڈاری" افسانے میں الطاف فاطمہ کرداروں کے ذریعے ماضی کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرتی ہیں کہ والدین کی پسند سے بچوں کی شادیاں کی جاتیں اور بچے ہنسی خوشی دعوتیں کھاتے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ ذوالمنن اور ظل ہما کا کردار بھی ایسا ہی ہے جو والدین کی پسند سے شادی کرتے ہیں اور شادی کے بعد تمام رشتہ داروں کے ہاں دعوتیں کھاتے ہیں اور سب مل کر کھانا کھاتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن آج کل سب دلہا دلہن کو دوسرے ملک بھجواتے ہیں کہ وہ اکیلے وقت گزاریں اور زندگی سے لطف اندوز ہوں۔ امریکہ میں جب انھوں نے دعوت کی تو ان کی خواہش تھی کہ اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے ماضی کی طرح دعوت کریں اور سب

کو کہا گیا کہ وہ اپنے ولیمے کا لباس پہن کر آئیں۔ اس دعوت میں ماضی کی طرح سب ڈھولک کی تاپ پر گانے گائے اور ان گانوں سے سب پر ناسٹلجیا طاری ہو گیا کہ پہلے صرف بیٹیاں بابل کا گھر چھوڑ کر جاتی تھیں۔ لیکن آج جدید دور میں زندگی کو سٹیٹس کے مطابق لانے کے لیے بیٹوں کو بابل کا گھر چھوڑنا پڑتا ہے اور دوسرے ملک میں آکر روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے۔

> نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ ابا کی اونچی حویلی، ابا کی اونچی حویلی، اباؤں کی اونچی حویلی سے بیٹیوں کو زبردستی بچھڑنا پڑتا تھا۔ لیکن یہ دن بھی آنے تھے کہ بیٹے بھی اپنی خوشی اور رضا اپنے اباؤں کی اونچی حویلیاں چھوڑ کر یہاں آئے۔[۵]

اس افسانے میں کرداروں کے طرزِ فکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی میں شادیوں پر سب عورتیں خود ڈھولک پیٹ کر گانے گاتی تھیں۔ مل کر گپ شپ لگاتی تھیں۔ روایتی انداز میں گانے گائے جاتے۔ سب مل کر ہر کام میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن آج کل سب کام ملازموں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ شادی کے لباس، زیورات دلہن خود پسند کر کے لے آتی ہے۔ کسی کی پسند پوچھی ہی نہیں جاتی اور میوزک چلایا جاتا ہے۔ بدیسی گانے گائے جاتے ہیں۔

مرد اپنی خواتین کی دل سے عزت کرتے تھے۔ خواتین اپنے شوہروں سے دب کر رہتی تھیں۔ مرد کو اپنی بیوی کو ڈانٹنے کا مکمل اختیار تھا۔ بچے بھی والدین کی خوشی اور مجبوریوں کو سمجھتے تھے۔

> ہم اور ہمارے بچے اپنی عادتوں، ضرورتوں اور اس ملک کی دی ہوئی عارضی آسائشوں کے اتنے غلام اور پابند ہیں کہ شاید کوئی طائر نہ دام بھی نہ ہو گا۔ لیکن خیر آپ کو کیا ہم تارکینِ وطن اپنی بیگمات سے اتنے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتے۔ بات اگر بڑھتی چلی جائے تو پتہ ہے کہ یہاں کے عائلی قوانین اتنے سخت اور اتنے پٹھے ہیں کہ وہ خواتین کو عائلی زندگی کے تار و بود بکھیرنے اور آشیانے کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دینے پر اکساتے اور ترغیب دیتے ہیں۔[۶]

الطاف فاطمہ کے افسانے "تصویر" میں اس کے مرکزی کردار کا حال اور ماضی کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کی بیوی جب جب اسے دیکھتی ہے اس کے ماضی میں کھو جاتی ہے کہ اس کے حال اور ماضی میں واضح فرق موجود ہے۔ ماضی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کے طرزِ زندگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کے ذریعے ہماری تہذیب و ثقافت، روایات اور طرزِ فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ آج جب وہ اسے پیسے ایک والٹ میں ڈالتے دیکھتی ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ وہ ماضی میں کس طرح پیسے رکھا کرتا تھا۔

> ہیڈ کوارٹر سے اپنے پیسے لایا تو کونے میں بیٹھ کر پاجامے کے نیفے کے قریب باقاعدہ چور جیب سی بنا کر پیسے اس میں سی دیئے۔[۷]

پہلے زمانے میں ہمارے ماضی میں بزرگ سفر کا ارادہ باندھتے یا پیسے رکھنے ہوتے تو یہی طریقہ اپنائے جاتے تھے۔اس کے ذریعے وہ اپنے پیسوں کو محفوظ سمجھتے تھے لیکن آج کل تو بینک میں پیسے رکھے جاتے ہیں۔

اس افسانے میں اس کو حال میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ وہ مکمل طور پر بدل گیا ہے۔اس کی شخصیت بدل گئی ہے۔اس کی بیوی اس کے کردار کو دیکھتے ہوئے نوسٹالجک ہو جاتی ہے۔اس کا ماضی یاد آتا ہے۔

> گھر میں وارد ہوتا تو ایک اودھم مچ جاتا۔گھر کی دیواریں اور دروازے کھڑکیاں تک پناہ مانگنے لگتی تھیں۔ امتحان میں مصروف لڑکے لڑکیاں ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں مانگتے۔یا اللہ! ان کی پوسٹنگ ہیں اور کی ہو جائے۔[9]

اس افسانے میں تصویر عنوان کے ساتھ ساتھ ایک گہرے معنی لیے ہوئے ہے۔مصنفہ اس کے ذریعے یہ بیان کرنا چاہتی ہیں کہ مرکزی کردار نے رسالے میں ایک تصویر دیکھی تھی،اسے پسند آئی تو اسے کاٹ کر ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ماضی میں تصاویر لی جاتی تھیں اور انھیں ہمیشہ پیار سے سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔لیکن آج کے جدید دور میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔موبائل کیمرے کے ذریعے تصاویر لی جاتی ہیں اور ان کی کوئی قدر بھی نہیں ہے۔

"رتن جوت" افسانے کا مرکزی کردار ہمیشہ اپنے آپا کے بنائے شہروں میں گم رہتا تھا اور جب اچانک اپنی بیوی صفیہ کی دوست رتن جوت سے ملاقات ہوتی ہے تو آپا کے بنائے چہرے یاد آجاتے ہیں جو آپا ہر وقت بنایا کرتی تھیں۔رتن جوت کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ان چہروں میں روح بھر دی گئی ہو اور آپا کے ساتھ گزارا وقت یاد آتا ہے۔ رتن جوت کا کردار ایسا کردار ہے جو عام عورت کا کردار ہوتا ہے۔نوکری کرنے کے باوجود گرو کو طریقے اور سلیقے سے سجایا ہوا ہے۔ہر چیز میں نفاست جھلکتی ہے۔ایک مشرقی عورت کا انداز نظر آتا ہے۔مرد سے ڈرتی ہوئی اور اپنے گھر کو بچانے کے لیے بے شمار قربانیاں دینے والا کردار ہے۔

> بظاہر وہ گھر میں اسی طرح رہتی۔گھر کے سارے کام انجام دیتی،بچوں کو سکول سے لاتی۔ان کے میرے اور خود اپنے لباس اسی انہماک سے درزی سے سلواتی۔چھوٹی چھوٹی شاپنگ کے علاوہ ملنا ملانا سب کرتی لیکن مجھے پتا تھا کہ اس کے اندر ایک کڑھن،تناؤ،تعصب،حسد اور رنجش کا عمل جاری ہے اور اس عمل کی گواہی اس کے چہرے کی بہت خفیف لکیروں اور زاویوں سے ملتی تھی۔[10]

رتن جوت کی بیوی کا کردار بھی عام گھریلو،روایتی بیوی کا کردار ہے جسے شک ہے کہ اس کا مرد کسی اور عورت میں دلچسپی لے رہا ہے اور خاموشی سے سسکیوں کے ساتھ روتی ہے۔لیکن گھر ٹوٹ جانے کے خوف سے خاموش رہتی ہے۔مرکزی کردار،رتن جوت اور صوفیہ کا کردار نوسٹالجک ہے۔ان کرداروں کے ذریعے ماضی کے کرداروں کا طرزِ فکر اور طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔

"رنج سفر" افسانے کی مرکزی کردار نے اس افسانے میں اپنا سفر بیان کیا ہے۔ سفر سے مراد ماضی میں گزرا ہوا دور۔ وہ راستہ جو ماضی میں شروع ہوا تھا اور آج بھی وہ سفر چل رہا ہے۔ ماضی کا وہ وقت جس کو انسان سب سے مضبوطی سے پکڑے رہنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں کردار کے تناظر میں ناسٹلجیا موجود ہے۔ ایک کردار اپنے ماضی کا گزرا ہوا زمانہ بیان کرتا ہے کہ ریلوے کا نظام کیسا تھا اور آج حال میں ریلوے کا نظام کیسا ہے۔

> نہ قطار بندی کا سنجیدہ اہتمام تھا۔ نہ ریلوے کی اجلی کراری وردیاں نظر آتی تھیں۔ آہ مرحوم استعمار اور جب کرسی کے طویل اور عام حجم سے زیادہ چوڑے ہتھوں پر کچھ اور مضبوطی سے ہاتھ جم گئے تھے۔ شدید گرمی، پنکنگ آفس کے دھکے۔[11]

اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے کہ علم کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے لیکن علم حاصل کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ بہت بڑے اور مہنگے ادارے میں جاؤ۔ کیونکہ ماضی میں تو ٹبوں میں لپٹ کر اندھے کنوؤں میں مقید رہ کر وہ تھیوریاں، کلے اور مسئلے وضع کرتے تھے۔ آج علم کی آبرو کے لیے بڑی نمود و نمائش چاہیے۔ علم حاصل کم کیا جاتا ہے اور دکھاوا زیادہ کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کو وہ عزت نہیں دی جاتی اور طلباء جس شوق کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آج وہ شوق ختم ہو گیا ہے۔ مصنفہ نے اپنی تحریروں میں ناسٹلجیا بیان کیا ہے۔ ناسٹلجیا بیان کرتے ہوئے ماضی کی روایات، اقدار کو بیان کرتے ہوئے ماضی کی روایات، اقدار کو بیان کرتے ہوئے حال سے اس کا تقابل کیا ہے۔ کرداروں کے مزاجوں میں جو واضح تبدیلی آئی ہے اس کو بیان کیا ہے۔

"خستہ خانم" افسانے میں دو کردار بیان کیے گئے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار لیلیٰ اور خستہ خانم کا دوست ہے۔ لیلیٰ کو حال میں دیکھ کر وہ ہمیشہ ماضی میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کے ماضی کو بیان کرتا ہے۔ آج جب اچانک بازار میں لیلیٰ کو دیکھا۔ حال میں لیلیٰ بے حد جدید اور ماڈرن ہو چکی تھی۔ دوپٹہ کندھے پر لٹکایا ہوا اور اونچی ہیل پہن کر ٹک ٹک کرتے جا رہی تھی تو اسے اچانک اس کا ماضی یاد آ گیا۔ اس کردار کو دیکھ کر وہ ماضی کے تناظر میں چلا گیا کہ ماضی اور حال میں کتنا فرق آ گیا ہے۔

> بدلباسی، جی بدلباسی کہ وہ گھر پر تو سارا وقت اپنی بڑی بہن کی اترنوں پر ہی گزارا کرتی تھی اور اس کی بڑی بہن کا قد کچھ ناٹا یعنی گٹھا سا تھا اور اس کا یہ تھا کہ لمبی یونگاسی نکلتی چلی آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ہر صبح جب وہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے تو ایک آدھا انچ بڑھ جاتی ہے۔
>
> تو ظاہر ہے کہ پنڈلیاں تو شلوار کے پائنچے سے باہر ہی باہر رہتی تھیں اور پائنچے تھے کہ پنڈلیوں سے کشیدہ ہی رہتے۔[12]

لیلیٰ کو بچپن میں لباس پہننے کا کوئی طریقہ یا سلیقہ نہ تھا۔ قمیض کا بھی عجیب سا حال ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف

پتہ لگ جاتا تھا کہ اس نے بہن کی اترن پہنی ہوئی ہے اور حال میں اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لیلیٰ ہے۔

اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ ماضی میں گھروں کی ساخت کیسے ہوتی تھی۔ کچھ انگریزی طرز کے گھر بنے ہوئے تھے کیونکہ جو انگریزوں کے ساتھ رہتے تھے۔ انھی کی طرح کے گھر بنانا پسند کرتے تھے۔ اس کے برعکس لیلیٰ کا گھر عام سا گھر تھا۔ لیکن آج حال کے گھروں سے قطعی مختلف۔ ہم جوں جوں ترقی کرتے جارہے ہیں اپنی تہذیب سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ انگریزی طرزِ عمل کو اپنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

> انگریزی وقتوں کی ساخت پر بنی ہوئی۔۔۔ وہی مضبوط ستونوں پر قائم کھلا کھلا سا پورچ، پورچ کے ساتھ چند سیڑھیوں پر، نیم دائرے میں بنا گول سا برآمدہ جس کے دریام اور قیمتی کروٹنوں کے گملوں سے گھرے ہوئے بڑے خوبصورت لگتے تھے۔ برآمدے سے آگے گیلری تھی۔ ٹھنڈی اور نیم تاریک اور گیلری غلام گردش کے انداز میں بڑے بڑے بال نما کمروں کے درمیان سے مڑتی ہوئی کچھ پینٹری تک پہنچتی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف احاطہ تھا۔[۱۳]

اس کے برعکس لیلیٰ کا گھر ان کی کوٹھی کے پیچھے چراگاہ کے انداز کا میدان تھا۔ مصنفہ اس دور کے بنائے گھروں کے انداز کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ نان گزیٹڈ افسران کے کوارٹر نما بنگلے بھی ہوتے تھے۔ سفید پوشوں کے لیے برطانوی عہد کے سرخ اینٹوں اور سیمنٹ سے تعمیر کردہ صاف گھر ہوتے تھے اور بچے وہیں کھیلا کرتے تھے۔

لیلیٰ کو دیکھ کر ماضی میں اس کے ساتھ گزارا تمام وقت یاد آتا ہے کہ وہ لڑکی جو ماضی میں عام سی رہتی تھی۔ ماضی میں ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن حال میں واضح تبدیلی آنے کی وجہ سے اس میں بھی واضح تبدیلی آگئی ہے۔ جدید انداز کو نقل کرتے ہوئے کانٹے سے کھانا کھانے کی کوشش کرتی ہے اور کنبے کی واحد پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے تہذیب و ثقافت سے دور ہوگئی ہے۔ جدید انداز کو اپنا کر وہ اپنے ماضی سے نکلنا چاہتی ہے۔ دونوں نے ماضی کو یاد نہیں کیا۔ ماضی کی باتیں نہیں کی۔

دادی کو دیکھ کر پرانا وقت یاد آتا ہے۔ جب ماضی میں سب مل کر بیٹھتے تھے۔ مل بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ باہر بیٹھ کر دھوپ سینکی جاتی تھی۔ لیکن آج سب اپنی زندگی میں اتنا گم ہیں کہ کسی کے پاس بھی دوسرے کے لیے وقت نہیں ہے لیکن آج وہ سب کر کے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔

> ہم نے وہیں لان پر گولڈ مہر کے سائے میں ان کی چارپائی کے ساتھ ٹیبل رکھوا کر کھانا کھایا۔ سردیوں کی دوپہر میں دادی جان ہمیشہ دھوپ چھاؤں کے درمیان گولڈ مہر کے سائے میں چارپائی ڈلوا کر دھوپ سینکتی تھیں اور وہیں ٹیبل لگوا کر ہم سب کو کھانا کھلاتی تھیں۔[۱۴]

مصنفہ کو اس بات کا بے حد دکھ ہے کہ ماضی میں جو ہماری روایات تھیں۔ وہ ہم سب بھول بیٹھے ہیں۔ جدید بننے کے چکر میں اپنوں کی روایات اور پیار محبت کو بھول بیٹھے ہیں۔ اس افسانے میں مصنفہ تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہوئے موسموں کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ صاف شفاف، نیلا آسمان، پیروں تلے لان کا سبزہ، لان میں چھن چھن کر آتی دھوپ ہوتی تھی۔ لیکن آج کل ہر جگہ پر ہتھوڑا گروپ، کلاشنکوفیں، ہیروئن اور منشیات کے بارے میں سننے کو ملتا ہے۔

"وہ جسے چاہا گیا" افسانے میں مصنفہ نے پاکستانی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے کہ پاکستانی والدین اپنی اولاد کو کیا تربیت دیتے ہیں۔

> جدھر جدھر یہ چلا کریں لوگ پردے تان کر چلا کریں اور یہ کہ اکیلے وکیلے نہ جانے دیا جائے۔ گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا کوئی دوسرا معتبر شخص کے ساتھ چلا کرے اور نامحرم گھر میں آواز دیئے بغیر داخل نہ ہوں۔[۱۵]

پاکستانی اس سب تہذیب و ثقافت کو اپناتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے اور حبیبہ کا کردار بھی ایسا ہی کردار ہے جو کوئی بھی مرد آتا تو جلدی سے سر پر دوپٹہ کر لیا کرتی اور قہقہہ لگاتے ہوئے خاموش ہو جاتی۔ جم نکولیس جب بھی کسی آزاد خیال لڑکی کو دیکھتا تو اسے ہمیشہ حبیبہ یاد آجاتی۔ ماضی میں اسے گزارا ہوا سارا وقت یاد آتا ہے۔ حبیبہ کی طرزِ زندگی سے پاکستانی تہذیب و ثقافت نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس حال میں جدید خیالات کے حامل افراد موجود ہیں جن کا تہذیب و ثقافت سے کوئی لینا دینا نہیں۔ ماضی کے کردار اور حال کے کردار میں واضح فرق ہے۔ دونوں کردار اپنے اپنے حالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لیے الطاف فاطمہ کو حال اور ماضی میں واضح فرق نظر آتا ہے اور اس فرق کو اپنے افسانوں میں اپنی تحریروں میں بیان کرتی ہیں۔

"کہیں یہ پروائی تو نہیں" افسانے میں مصنفہ ماضی کے دھندلکوں میں گم نظر آتی ہیں۔ ڈیری فارمنگ کو دیکھتے ہوئے وہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں جہاں انھیں مویشیوں کی خوراک میں سرسوں کی کھلی اور بھوسے کے اجزاء شامل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ جہاں لوگ جانوروں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ ان کا خالص دودھ پیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل دودھ کیمیاوی اجزاء پر مشتمل ہے۔ مصنفہ جب بھی ماضی میں گم ہوتی ہیں تو انھیں لگتا ہے کہ وقت نے انھیں پکارا ہے۔ ماضی کے راستوں پر جانے سے شاید وقت مڑ کر پیچھے دیکھ لے۔

مصنفہ آج کے دور میں جب یہ دیکھتی ہیں کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں آج کل باہر جانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ گھر والوں کے ساتھ دوستوں کے ساتھ کم وقت گزارا جاتا ہے۔ زیادہ شاپنگ کرنے اور گھومنے پھرنے میں وقت

گزارا جاتا ہے۔اس کے بر عکس مصنفہ کو اپنا ماضی یاد آتا ہے۔

> گرمی کی ساری چھٹیاں یوں ہی پھاٹک کے دروازوں پر جھولتے اور سمر ہاؤس کے اندر مار دھاڑ سے بھرپور کھیل کھیلتے گزر جائیں۔ڈاکو پکڑے جاتے اور پولیس اور ڈاکوؤں میں زبردست جھڑپیں ہوتیں اور پھر ایک دم ڈاکو توبہ کر کے کچے امرودوں اور شہتوتوں کی دکانیں لگا لیتے۔ گملے پھوڑ پھوڑ کر اور گھس گھس کر سیر آدھ سیر کے بٹے اور سکے بنائے جاتے۔[1]

سب بچے مل کر کھیلتے تھے۔ اکٹھے وقت گزارتے تھے لیکن آج کل اپنوں کے ساتھ چھٹیاں نہیں گزاری جاتیں۔

الطاف فاطمہ کو اپنا ہمسایہ ربی دت شدت سے یاد آتا ہے۔ جس کے ساتھ بچپن میں وقت گزارا تھا۔ مل کر رہتے تھے۔ ربی دت ہندوستانی لڑکا تھا لیکن آج کل ہندو مسلم میں وہ پیار نہیں جو پہلے ہوتا تھا۔ مصنفہ ہجرت سے پہلے ہندوستان میں رہتی تھیں۔ وہاں سب مل جل کر رہتے تھے۔ کوئی ہندو مسلم نہیں تھا۔ سب آپس میں مل کر رہتے تھے۔ مصنفہ کو ہجرت کا بہت زیادہ دکھ ہے۔ یہی دکھ ان کے تمام افسانوں میں نظر آتا ہے۔ انھیں اپنے بچپن سے ماضی کی یادوں سے محبت ہے۔

یہ افسانہ مکمل ماضی کی یادوں میں گم ہے۔ مصنفہ خود ماضی میں گم ہیں۔ انھیں یاد ہے کہ ربی دت ان کا منہ بھولا بھائی تھا۔ زبردستی ان کے ساتھ کھیلتا، جھولے جھولتا اور گوشت کھانے کی فرمائش کرتا۔ ربی دت نے ان سے راکھی باندھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے راکھی باندھی۔ ہاتھ میں تین تین راکھیاں باندھ کر وہ بہت خوش تھا اور ربی دت سفید جھاگ سی دھوتی لیس والا کرتہ اور گاندھی کیپ لگائے پیتل کے تھال میں چاول اور کیلوں کے ساتھ آٹھ دس آنے دروازے رکھ کر وچھنا دے کر آتا۔ اس کے دل میں اور ان کے دل میں ایک دوسرے کے لیے احترام تھا۔ ذات پات نسل سے کوئی لینا دینا نہیں۔ آج کل سب سے وال ہی یہی کیا جاتا تھا کہ کس ذات برادری سے ہو۔ ربی دت ہمیشہ یہ جواب دیتا کہ میں بیگم صاحب کا بیٹا ہوں۔

ہندوستان میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ کوئی ہندو مسلمان نہیں تھا لیکن ہندو مسلم فسادات کے بعد سب ختم ہو گیا۔ انھی رشتوں کے درمیان نفرت پیدا ہو گئی۔ ربی دت تو میلاد میں بھی مکمل حصہ لیتا تھا۔ عطر لگاتے، گلاب پاس سے گلاب چھڑکتے۔

مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہے کہ آج کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔ بزرگوں کے پاس بچے نہیں بیٹھتے جب کہ ماضی میں سب سر شام ہی لحافوں میں دبک جاتے اور بزرگوں سے کہانیاں سنی جاتی۔ لیکن آج کل کی نوجوان نسل کے

پاس بزرگوں کی باتیں اور ہجرت کے واقعات سننے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہے کہ فسادات کی وجہ سے انھوں نے ہجرت کی۔ لیکن اس بات کی شدت سے خواہش ہے کہ وہ ہندوستان جا کر ربی دت کو راکھی باندھیں۔ مصنفہ کو بھولی بسری باتیں یاد آرہی ہیں۔ اس افسانے میں ہندوستان کی طرزِ زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ ماضی کی خوبصورت یادوں کو بیان کیا گیا ہے۔

"بازگشت" افسانے میں مصنفہ نے جمیلہ اور تابندہ کا کردار ادا کیا ہے۔ تابندہ جو حال کا ایک کردار ہے۔ اس کو دیکھ کر مصنفہ کو ماضی کا ایک کردار جمیلہ یاد آتا ہے۔ تابندہ حال کا ایسا کردار ہے جو جدید وقت کے مطابق ہے۔

> اس کے بال بے حد اونچے کیے ہوئے تھے۔ وہ بہترین شلوار قمیضوں کے علاوہ سلیکس اور ٹوئن سٹ پہنا کرتی تھیں۔ فراٹے سے انگریزی بولتی تھی۔ البتہ مجبوراً اردو بولنا پڑے تو پہلے بڑی فخریہ عاجزی سے اٹک اٹک کر معذرت خواہ ہوتی تھی:
> معاف کیجئے گا مجھے اردو نہیں آتی۔[۱۷]

تابندہ ہر ہفتے سینما جایا کرتی تھی۔ زندگی کو مکمل بھرپور انداز میں گزار رہی تھی۔ مصنفہ کو ماضی کا کردار جمیلہ یاد آیا۔ جمیلہ بھی ایسی ہی خواہشات رکھا کرتی تھیں۔ سیر کے پروگرام بنایا کرتی تھی۔ لیکن اس کی دادی ہمیشہ یہ کہہ کر خاموش کروادیتی تھیں کہ بیٹا پہلے بڑی ہو جاؤ۔ لیکن جمیلہ کے بڑے ہونے پر ماضی کی روایات کو اپناتے ہوئے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروادیا گیا۔

> وہ اس بات پر راضی کر لی گئی کہ ہم جس سے کہیں اس سے ملو اور جہاں کہیں وہیں جاؤ اور پھر جب سہرے کی گھڑی آئے تو پھر اچھی بیٹیوں کی طرح ساری رسم و رسوم اور باجے کے ساتھ اپنے گھر یوں سدھارو کہ ایک دنیا دیکھے اور حسد کی آگ میں جل جائے۔[۱۸]

اس افسانے میں جمیلہ کا کردار بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج کو بیان کیا ہے۔ اس کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طرزِ زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ تابندہ حال کا کردار ہے۔ اس کے ساتھ آج کے رسم و رواج کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تابندہ کو ہمیشہ یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ خود کو بنا سجا کر ہمیشہ رکھا کرو۔ لڑکوں سے ملا کرو اور اپنے لیے خود لڑکے کا انتخاب کرو۔ اپنے اندر اسٹائل پیدا کرو۔

مصنفہ کو اس بات کا شدت سے دکھ ہے کہ تابندہ نئی نسلوں کو بھی یہی تلقین کرے گی۔ تمام تہذیب و ثقافت ختم ہو جائے گی۔ ماضی سے کوئی لینا دینا نہیں رہے گا۔ یہ اس معاشرے کا المیہ ہے کہ وہ جدید ہونے کے چکر میں ماضی کی روایات کو بھولتا جاتا ہے۔ جمیلہ کا کردار ماضی کے تناظر میں ہے۔ پرانی روایات نظر آتی ہیں لیکن تابندہ میں ماضی کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔ مصنفہ حال اور ماضی کا تقابل بیان کرتے ہوئے جمیلہ اور تابندہ کا کردار پیش کرتی ہیں۔

"شہیر" افسانے میں مصنفہ نے جہاں آراء کا کردار بیان کیا ہے جہاں آراء حال میں ہوتے ہوئے ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ بار بار ماضی کا حوالہ دیتی ہیں۔ جہاں آراء اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے سوئٹزر لینڈ جا رہی تھیں۔ ڈیوٹی پر موجود لڑکیوں کو دیکھ کر اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے کہ کل کو وہ خود ڈیوٹی پر موجود ہوتی تھی اور مسافروں کی خدمت کیا کرتی تھی لیکن آج ڈیوٹی پر موجود لڑکیاں اس کی خدمت کر رہی ہیں۔

جہاں آراء کو ڈیوٹی پر موجود کھڑی لڑکیاں اس کے ماضی میں لے جاتی ہیں۔ اسے ہوسٹل کی پہلی رات یاد آتی ہے جہاں اس کے ساتھ اور بھی نئی آنے والی لڑکیوں کو تنگ کیا گیا اور ان سے تعارف کروانے کو کہا گیا اور نام بتانے پر گانا سنانے کی ضد کی گئی اور نئی آنے والی لڑکیوں کو پریشان کیا جاتا تھا۔

جہاں آراء ماضی میں گم ہو کر اپنے بچپن کو بیان کرتی ہیں کہ ان کا طرزِ زندگی، رہن سہن کیسا تھا۔ آنکھیں بند کر کے وہ خود کو ماضی میں لے جاتی ہیں۔

> وہ اپنے مختصر سے مکان میں چل پھر رہی ہو۔ اندھیرے میں سوئی بہن اور امی کے پلنگوں کے درمیان دھیرے دھیرے گزر رہی ہو۔ یہ گڈو کا پلنگ ہے اور وہ پپو کا۔ امی کا چارپائی کے قریب چھوٹی سی پلنگڑی پر سوئی ہوئی حسن آراء، صبح ہی صبح وہ حسنا کو گود میں لے کر تیار کرتی۔ سفید چینی کے گلاس میں گرم گرم دودھ ڈال اس کو پلا ہی رہی ہوتی کہ امی کی آواز سنائی دیتی، وہ جاگتے ہی اس کو آواز دیتی تھیں۔
> امی جی، لوٹے میں وضو کا پانی رکھا ہے۔[19]

جہاں آراء ماضی میں گم ہو کر آس پاس کی دنیا سے بہت دور ہیں۔ انھیں یاد آتا ہے کہ ان کی ماں ہمیشہ وظیفہ کرتی تھی اور اس دوران کوئی بات نہ کرتیں کہ ورد نہ ٹوٹے۔

جہاں آراء نہ صرف ماضی کو بیان کرتی ہیں بلکہ اس وقت کی تہذیب و ثقافت، طرزِ زندگی کو بیان کرتی ہیں۔ مصنفہ ماضی کا حوالہ اس لیے دیتی ہیں کہ اس کے ذریعے وہ ماضی کے طرزِ زندگی کو بیان کرتی ہیں جہاں آراء کے کردار کو ماضی کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔

> اچانک ہی اس کو نیم کی چھاؤں میں بنی ہوئی چبوتری کا دھیان آگیا جس میں ہر صبح شام مٹی کی انگیٹھی میں سلگتے ہوئے اپلوں پر جوش کھاتے ہوئے دودھ کی سوندھی سوندھی خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوتی تھی۔ اسکول جانے سے پہلے وہ اسی چبوتری پر رکھی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ کر گلاس میں اجلا اجلا گرم بالائی ملا دودھ ڈال کر پھونکیں مار مار کر پیتی تھیں اور پھر کسی چٹیا باندھے، بستہ اٹھائے موٹی ململ کا دوپٹہ سر پر لیے اسکول جایا کرتی تھی۔[20]

اس پیرا گراف میں مصنفہ نے جہاں آراء کے بچپن کو بیان کرتے ہوئے ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے دراصل

اس دور کی طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے۔ حال کا طرزِ زندگی اس سے مختلف ہے۔ اک چبوتری کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا بلکہ کھانے کا طریقہ ہی مکمل مختلف ہو گیا ہے۔ مصنفہ کو ماضی کی طرزِ زندگی پسند تھی۔ وہ انداز، رہن سہن، طور طریقے، رکھ رکھاؤ سے انسیت تھی۔ اس کے علاوہ ماضی کے کرداروں کی سوچ کو بیان کیا گیا ہے۔ آج کل کی مائیں بچوں کی تربیت کا وہ انداز نہیں اپناتیں جو ماضی میں ماؤں نے اپنایا ہوا تھا۔ ماضی میں مائیں بچیوں کی تعلیم پر زیادہ زور نہیں دیتی تھیں۔ اس کے برعکس آج کل نہ صرف تعلیم بلکہ لباس اور دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کو فیشن سمجھا جاتا ہے۔ جہاں آراء کی ماں ہمیشہ اس کی تعلیم حاصل کرنے کا کہتیں۔

> بس بہت پڑھ لیا۔ کوئی ضرورت نہیں گھر سے اتنی دور رہنے کی۔ بس جی تم تو اب اس فرض سے ادا ہونے کی سوچو۔[۲۱]

اس افسانے میں جہاں آراء ایئر ہوسٹس کو دیکھ کر اپنے اضی کے کرداروں میں گم ہو جاتی ہے، اپنا ماضی یاد آتا ہے۔ مصنفہ نے اس افسانے میں ماضی اور حال کی طرزِ زندگی، طرزِ فکر کو بیان کیا ہے جس میں واضح فرق موجود ہے۔ ماضی اور حال کے افراد کی سوچ نہ صرف مختلف ہے بلکہ اندازِ زندگی بھی مختلف ہے۔ ہوسٹل میں رہتے ہوئے جہاں آراء اور اس کی دیگر ساتھیوں میں بھی فرق ہے۔ کچھ انتہائی امیر خاندان سے ہیں۔ ان کے چونچلے ختم نہیں ہوتے اور کچھ اس کی طرح مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہے کہ ایک ہی ہوسٹل میں رہتے ہوئے ان کی زندگی میں یکسانیت کیوں نہیں ہے۔ جہاں آراء نے اس طرزِ زندگی کو اپنانے کی خواہش کی اور اس کے لیے اس نے ان کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ اس کے اباجی کہتے ہیں کہ اسے پر لگ گئے ہیں اور وہ خود بھی چاہتی تھی کہ وہ بلندیوں ہی میں پرواز کرے۔ زمین کی پستیوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ رہے۔ جہاں آراء کا کردار ایسا ہی کردار ہے جو حال میں ماضی کی روایات، تہذیب و ثقافت سے جان چھڑا کر حال کے مطابق رہنا چاہتے ہیں۔ آج کے دور میں ہمارے معاشرے میں تمام ایسے کردار موجود ہیں جو ماضی سے تعلق ختم کر کے حال میں جینا چاہتے ہیں۔ مصنفہ تہذیب و ثقافت کو ختم ہوتے دیکھ کر افسردہ ہے۔

"سلور کنگ" افسانے میں مصنفہ نے سلور کنگ کا کردار بیان کیا ہے۔ ایسا کردار جو ماضی میں انگریزوں کے ہاں کام کرتا تھا اور خوب مزے کی زندگی گزار رہی تھی۔ حال میں بے روزگاروں کی طرح زندگی گزار کر اسے پاکستانیوں سے نفرت ہو گئی کیونکہ ماضی میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ سب کا خیال رکھتے تھے۔ اس کے برعکس حال میں صرف مہنگائی اور غربت ہے۔ کوئی کسی کا خیال نہیں رکھتا۔ سلور کنگ غربت میں اپنے ماضی کے دنوں کو یاد کرتا ہے۔

آہ! وہ دن جب سیل اور میٹروپول کی عشرت بار موسیقی کی گتوں پر وہ آن بان سے اونچے اونچے انگریزوں یعنی صاحب لوگوں کی میزوں پر کافی اور بڑھیا شرابیں سرو کیا کرتا اور چاندی کی پلیٹ میں بل لگا کر ان کے سامنے مودب جاتا اور کلف زار مور کے پنکھ کی طرح سجیلے طرے دار صافے والا سر جھکا کر ان کے سامنے بل پیش کرتا اور ہائے وہ صاحب کا انداز سے بٹوہ نکال کر بل ادا کرتا۔ سگریٹوں اور شراب کی مخمور اور بوجھل فضاؤں میں بیٹھے ہوئے صاحب اور ان کی نیم عریاں میم لوگ اور شیشوں کے باہر سے نظر آتے ہوئے شملے کے مناظر۔[۲۲]

ماضی کا ذکر کرتے ہوئے انگریزوں کی طرزِ زندگی، تہذیب و ثقافت اور رہن سہن کو بیان کیا گیا ہے۔ اب پاکستان کے حالات بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ پاکستان کی ساری دولت امیروں کے گھر میں ہی آتی ہے۔ انھیں غریبوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ لگتا ہے کہ امیروں کے نلکوں سے پٹرول نکلتا ہے اور سونا اور کیڑے گھروں میں اگا رکھے ہیں۔ ماضی میں امیر غریب سب مل کر رہتے تھے۔ لیکن اب سلور کنگ حال کی تہذیب کو بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ وہ جس میم کے گھر ان دنوں کام کر رہا تھا۔ شدید گرمی میں جب وہ کام سے آیا تو فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پانی پیا تو اگلے دن فریج کو تالا لگا دیا گیا۔ ماضی میں تو ملازموں کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ رکھ رکھاؤ ہوتا تھا لیکن حال میں ماضی کی روایات، تہذیب و ثقافت کو نہ صرف نظر انداز کیا جا رہا ہے بلکہ مکمل چھٹکارا حاصل کر لیا گیا ہے۔ مصنفہ کو اسی بات کا دکھ ہے اس لیے وہ نوسٹالجک ہو کر ماضی کی روایات، طرزِ زندگی کو بار بار بیان کرتی ہیں۔ اس کے ذریعے وہ آج کی نسل کو اپنی تہذیب و ثقافت سے آگاہ کرنا چاہتی ہیں جسے ہم بھول بیٹھے ہیں۔

نوسٹالجک ہونا کوئی عام و خاص بات نہیں۔ حال میں وہ تمام لوگ جنھوں نے ہجرت کی ہے یا ماضی کی تہذیب و ثقافت اور روایات کو اپنایا ہوا تھا۔ حال کو دیکھ کر ماضی کو یاد کرتی ہیں اور اپنی نئی نسل کو حال اور ماضی کا فرق بیان کرتی ہیں۔ جوں جوں ہمارے معاشرے سے روایات، تہذیب و ثقافت اور رکھ رکھاؤ کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ تمام بزرگ افراد اس بات پر افسردہ ہیں۔ وقت نے ہمارے سماجی اور معاشرتی رویوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے ان کے کردار وقت اور حالات سے بددل ہو کر ماضی میں پناہ لینا چاہتے ہیں اور ماضی میں پناہ حاصل کر کے سکون محسوس کرتے ہیں۔

"ٹڈی چٹا سویٹر" میں مصنفہ نے اس سویٹر کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس میں مرکزی خیال نے یہ سویٹر پہنا ہوا ہے۔ یہ سویٹر کافی پرانا ہو چکا ہے اور ٹڈیوں نے جگہ جگہ سے اس کو کھا لیا ہے۔ اس سویٹر کو پہن کر وہ اس کے پرانا ہونے کے ساتھ ساتھ پچھلے واقعات اور جنگ کے واقعات کو بیان کرتی ہیں۔ مصنفہ نے خود ہجرت کے مناظر دیکھے تھے۔ ہندو مسلم فسادات کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لیے اپنی تحریروں میں جنگ کو بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح ہجرت کے واقعات میں لوگوں کو نقصان ہوا۔ لوگ اپنا دکھ کبھی نہیں بھول سکتے۔ انھیں ہمیشہ کماد کو دیکھ کر یہ خیال آتا

ہے کہ انھوں نے کٹی ہوئی فصل وہیں چھوڑ دی تھی اور وہ فصل اداس تھی۔۔ ٹین اور تام چینی کے برتن استعمال کیا کرتے تھے۔اس وقت بچے بھی ایسا ہی کھیل کھیلا کرتے۔

ہم دیوار کا گھوڑا بنا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور ائیر گن چلانے کی مشق کیا کرتے۔ پہلے پہلے گل زری سے مشق کرتے تھے؟

گل زری کیا؟

بھئی ایک کیل سی ہوتی ہے نوک دار،اس کے پیچھے لال سبز سن کا ایک پھندنا سا لگا ہوتا ہے۔[۲۳]

مصباح کا کردار بھی ایسا کردار ہے جو اپنے ماضی کے واقعات بیان کرتی ہے اور ماضی میں کھو جاتی ہے کہ کس طرح بچپن میں سب نشانے لگایا کرتے تھے۔اس افسانے میں ماضی کی یادوں میں ایک یاد طرزِ زندگی سے متعلق ہے کہ تمام بزرگ سونے سے پہلے آیت الکرسی کا پڑھ کر بچوں پر پھونکتے تھے اور بچوں کو بھی پڑھنے کو کہتے ہیں۔اس طرح وہ خود کو اللہ کی امان میں دے کر سوتے تھے۔ لیکن آج کل کی نوجوان نسل بزرگوں کا خوف نہیں کھاتی بلکہ انھیں پرانے خیالات کا حامی قرار دیتے ہیں اور گاؤں کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح کسان اپنی فصلوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ لوگی پہن کر پگڑی باندھ کر لاٹھی کی مدد سے بھیڑ بکریوں کو ہانکا کرتے تھے اور مرچوں کو توڑا جاتا تھا۔ سویٹر کا ماضی بیان کرتے کرتے وہ جب مرچوں کا ذکر کرتی ہیں۔ دراصل مصنفہ نے سویٹر کا ذکر کر کے یہ بیان کیا ہے کہ جب جب اسے سویٹر بدلنے کو کہا جاتا تو وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ لوگ بھی تو پرانے ہو جاتے ہیں انھیں تو نہیں بدلا جاتا۔ یہ سویٹر ہمیشہ اسے ٦ ستمبر کی یاد دلاتا ہے۔ ٦ ستمبر کے تمام واقعات، حالات اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔اس لیے مرکزی کردار کو سویٹر کے ذریعے ماضی کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔

"سہارا" افسانے میں ایک خبر کے ذریعے ماضی کو بیان کیا گیا ہے۔ جمعدارنی کے کردار کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ آج کے دور میں سب گھروں میں مصروف ہیں۔ کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں ہے۔ فوجیوں کے گھروں میں جمعدارنی کام کرنے آتی تھیں جو ہر گھر میں کام کرنے کے بعد مختلف خبریں پھیلایا کرتی تھی۔ایک گھر کی خبر دوسرے گھر میں دیا کرتی تھی۔ ایک کمیونی کیشن سسٹم تھا لیکن اب وہ کمیونی کیشن سسٹم ختم ہو گیا ہے۔ لوگ ترقی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہے کہ ساتھ والے گھر میں کون رہ رہا ہے۔ کس کے گھر خوشی ہے اور کون غموں میں ڈوبا ہوا ہے اور اگر اسے دیر سے آنے پر ڈانٹا جائے اور کہا جائے کہ وہ کل سے نہ آئے تو وہ خود بخود آجاتی ہے۔

یوں تو جمعدارنی ان تمام نوٹسوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا کرتی تھی۔ البتہ اگر آواز میں رکھائی کا عنصر واقعی غالب ہوتا تو وہ برش کرتے کرتے وہیں ڈال دیتی اور بکھرے ہوئے کوڑے کے درمیان پھسکڑا

مار کر بیٹھ جاتی اور وہ سنسنی خیز خبریں سناتی کہ آخر اس کو بھی کھڑے سے بیٹھ جانا پڑتا اور نہایت چھچھاتی ہوئی آواز میں اس کو جھٹلاتی۔۔۔۔ تنہا زندگی میں گرم خبریں اور افواہیں بڑی رونق پیدا کر دیتی ہیں۔[۲۴]

مصنفہ ایک خبر کے ذریعے "تمام سابقہ فوجیوں کو دوبارہ بھرتی کیا جائے گا" اس ایک خبر کے ذریعے وہ ماضی میں چلی جاتی ہیں کہ فوج میں بھرتی کے دوران جمعدارنی گھروں کا کام کرنے آتی تھی اور کمیونی کیشن کا بڑا ذریعہ تھی۔ خبریں پھیلایا کرتی تھی لیکن آج کا وہ کمیونی کیشن سسٹم ختم ہو گیا ہے اور وہ ہمیشہ جمعدارنی سے باتیں کرتے ہوئے ماضی میں چلی جاتی تھی کہ ہم اس بنگلے میں رہتے تھے جو اب سٹڈی بن چکا ہے اور ہجرت کے وقت کو یاد کرتی ہیں۔

اس افسانے کی مرکزی کردار کال کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ جوں جوں کال میں دیر ہو رہی تھی۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ جمعدارنی کو اپنے ماضی کے بارے میں روز بتاتی تھی۔ لیکن جمعدارنی اسے یہی کہتی کہ انگریز لوگوں کو فوج میں نہیں بلایا جائے گا کیونکہ اس کی ماں اینگلو انڈین تھی۔ اس کے بہن بھائی باہر چلے گئے تھے لیکن اس نے خود جنگ میں حصہ لیا تھا۔ فرنٹ پر رہی تھی لیکن ابھی تک اسے کال نہیں آئی اور وہ وقت گزارنے کے لیے ماضی کی باتیں دہراتی تھی۔

> فیر جب بیرا ہم کو اسکول سے واپس لاتا تھا۔ ہمارا ممی ادھر گیٹ پر کھڑا انتظار کرتا تھا۔ فیر ہم کو ایڈنا کو اور چھوٹا نکسن صاحب ہوٹ ہوٹ ملک، ہوم میڈ جیم اور بڑ کھانے کو ملتا۔ فیر لوٹے ویلے ہم گھوڑے کی سواری کرتا۔ اے دیکھو! ادھر جیہڑا باغ کا حصہ کھالی پیا ہے، ادھر عارا اسی سالگا ہوا تھا۔[۲۵]

مصنفہ ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے وہ تمام شہر، سڑکیں جہاں اس کا بچپن، زندگی کا خوب صورت حصہ گزارا تھا۔ اس کی سلامتی کی دعائیں کرتی ہیں اور اپنے پاس موجود تمام اشیاء کو پیک کر کے وہاں کشمیریوں کے لیے بھیجتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ عملے کے تمام لوگ سامان میں سے اپنی ضرورت کی اشیاء نکال کر خود استعمال کر لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے گھروں میں چین سے بیٹھنے والے ہی خوب صورت لباس استعمال کر سکتے ہیں۔ کیمپوں کو زیب نہیں دیتے۔ یہاں پر لوگوں کی خدمت کی بجائے خود بار بار چائے منگوا کر پیتے ہیں اور کیمپوں کے لیے جو بسکٹ موجود ہیں۔ انھیں خود استعمال کر رہے ہیں اور جو امور گھروں میں ہونے چاہیے۔ وہ یہاں ہو رہے ہیں اور افسوس کے ساتھ وہ سوچتی ہے کہ اس کا وقت گزر گیا ہے۔ اس افسانے میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کو کھو دینے کا المیہ موجود ہے۔ ماضی میں کوئی مشکل میں ہوتا تو سب اس کے ساتھ مشکل وقت میں کھڑے ہوتے اور قیمتی اشیاء خلوص نیت سے بھجوائی جاتی۔ لیکن آج کل قیمتی اشیاء خود رکھی جاتی ہیں اور جو چیز کام کی نہیں ہے وہ ضرورت مند کو دی جاتی ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرزِ زندگی، سوچ، فکر بالکل تبدیل ہو گئی ہے۔ انھوں

نے اپنے ہاتھوں سے تہذیب و ثقافت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

"واپسی" افسانے میں مصنفہ نے ماضی کی تہذیب و ثقافت اور روایات کو بیان کیا ہے۔ مصنفہ خود جس گھریلو ماحول سے تعلق رکھتی تھی وہاں لڑکیوں کو بزرگوں کی عزت اور ان کی عزت کی خاطر جان قربان کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ والدین کی عزت کو ختم کرنے والی، بدنام کرنے والی کو ختم کر دیا جاتا ہے اور زبان سے اپنی پسند کا اظہار کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس افسانے میں دو کرداروں کو آپس میں محبت ہو جاتی تھی اور وہ ایک دوسرے سے ملتے باتیں کرتے نظر آتے ہیں اور وہ شادی کے لیے راضی ہوتے ہیں، کو بیان کیا گیا ہے۔ ایشلے کو جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھول جائیں گے اپنے پیار کو، تو اس جملے سے ایشلے کو اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے کہ ماضی میں وہ بھی کسی کو پسند کرتی تھی لیکن والدین کی عزت کی خاطر وہ سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی ہے اور وہ لڑکا کرسٹوفر بھی اس سے کوئی شکوہ نہیں کرتا بلکہ خاموش ہو جاتا ہے۔ دراصل ماضی کے ان دونوں کرداروں کو بیان کر کے ماضی کی طرزِ زندگی، سوچ اور فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جس میں مشترکہ خاندانی نظام کو فروغ حاصل تھا۔ تمام خاندان والے مل جل کر رہتے تھے۔ تمام افراد پیار و محبت سے رہتے تھے۔ کوئی بھی فرد اپنی روایات سے بغاوت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے خاندان کی عزت سب سے زیادہ اہم تھی اور ایشلے، کرسٹوفر کا کردار بھی اپنے ماحول اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ دونوں کرداروں کے دلوں میں اپنے ماحول اور اقدار، روایات سے خاص لگاؤ موجود ہے۔ اس لیے وہ اپنی کمٹمنٹ کو توڑ کر، قربانی دے کر ماحول اور اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہے اور اپنی آئندہ آنے والی زندگی کو بھرپور انداز میں والدین کی خوشی کے ساتھ گزارتی ہے۔

> بالکل ایسی ہی باؤلی سی عمر تھی اس کی اور وہ عجیب و غریب لڑکا کرسٹوفر جس کو وہ پیار سے کرس کہا کرتی تھی۔ دونوں کے رومانس کا انکشاف ہوا تو کتنی ناگواری پھیلی تھی۔ سکول میں بھی اور دونوں گھرانوں میں بھی۔۔۔۔ اور کرس اتنا گڈ بوائے نکلا کہ فوراً اس کے راستے سے سر جھکائے ہٹ گیا۔ بس وہ تو مسکرایا، دو قدم پیچھے ہٹا، اٹن شن ہو کر ایک فوجی کو سلیوٹ مارا اور اباؤٹ ٹرن ہو گیا۔[۲۶]

الطاف فاطمہ اپنی تحریروں میں اس لیے نوسٹالجک ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ حال کی تہذیب و ثقافت سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لیتی ہیں۔ ماضی سے خاص انسیت اور لگاؤ نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کے کرداروں کی زبان، سوچ، طرزِ زندگی میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ حال اور ماضی کے کرداروں کا تقابل بیان کرتی ہیں کہ قاری کو خود بخود ماضی سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ ماضی کی روایات کا دل سے عزت کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اس لیے مصنفہ کی تحریروں میں مایوسی نظر نہیں آتی بلکہ رجائیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

مصنفہ نے "جشنے دارد" افسانے میں ماضی کی طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے۔ علاقے کے ٹربائن کے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں کہ ماضی میں کمیونی کیشن سسٹم بہت مضبوط ہوتا تھا۔ ایک خبر دوسرے علاقے تک جلدی سے سفر کرتی تھی لیکن آج علاقے کے ٹربائن کے پھٹ جانے کی خبر نہ ہی گردش کر رہی ہے نہ اس کو پھیلانے کے لیے وہ کردار ہیں۔ مصنفہ کو دکھ ہے کہ خبر علاقے میں نہیں پھیلتی بلکہ جہاں پر خبر پیدا ہوتی ہے وہیں ختم ہو جاتی ہے کیونکہ خبر کو انسانی رابطوں کی ضرورت ہوتی ہے اور آج کے دور میں سب کے گھروں کی دیواریں اتنی اونچی ہو گئی ہیں کہ کسی کا بھی کسی سے رابطہ نہیں ہے۔ مصنفہ کہتی ہیں کہ پہلے جیسے حالات ہوتے تو ماضی کی طرح تمام لوگ پانی جمع کر لیتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ لیکن خبر نہ پھیلنے کی وجہ سے تمام لوگ ان دھلے منہ کے ساتھ گھروں میں انتظار کر رہے ہیں۔

مصنفہ جب حال اور ماضی کا تقابل کرتی ہیں تو کہتی ہیں کہ اب تو سڑک کے دونوں جانب صرف کوٹھیاں ہی بنی ہوئی ہیں۔ ملازموں کے علاوہ کسی کو یہ بات معلوم ہی نہیں کہ یہاں کوئی انسان بھی رہتا ہے یا نہیں۔ گلی میں تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ ماضی میں یہاں کچی آبادی اور جھگیاں ہوتی تھیں لیکن آپس میں پیار و محبت سے رہتے تھے۔

> اس وقت یہ گلی کتنی آباد تھی۔ کمیونی کیشن کتنا براہِ راست تھا۔
>
> ان دنوں مجھے سب پتا تھا کہ آج کل کون کون سے کنبوں کے درمیان بات چیت اور حصہ بخرا اور کون کون سے گھر آپس میں شیر و شکر ہو رہے ہیں۔۔۔۔ اور تو اور اس گلی کے آخری سرے پر واقع کچی آبادی کی اقتصادی اور معاشی صورت حال کا اندازہ تک میں اسی بالکنی میں کھڑے کھڑے لگا لیا کرتی تھی۔ فلاں کا کام اچھا چل رہا ہے۔ اب وہ نئی بائیسکل پر آتا جاتا ہے اور فلانے کا کام ان دنوں یوں ہی سا جا رہا ہے۔ چال میں تفکر اور استغراق نظر آتا ہے۔[۲۷]

مصنفہ ماضی کا حوالہ دے کر ماضی کی روایات، تہذیب کے بارے میں بیان کرتی ہیں کہ ماضی میں سب کا رابطہ ایک دوسرے سے مضبوط تھا لیکن آج کل کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے۔ کون خوش ہے کون اداس ہے، کسی کی منگنی، شادی ہو گئی ہے اور کون اپنے والدین کے گھر واپس آ گئی ہے۔ ان تمام باتوں کو جاننے کے لیے انسانی رابطوں کا ہونا ضروری ہے۔ مگر ہمارے معاشرے کا آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ترقی کے چکر میں سب ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہے۔ مصنفہ ماضی اور حال کا تقابل کر کے ماضی اور حال کے کرداروں کی طرزِ زندگی میں فرق کو بیان کرتی ہیں کہ گلی، محلے میں جو رونق ہوا کرتی تھی۔ ایک مجلسی زندگی تھی، وہ اب ختم ہو گئی ہے سب کچھ ویران ہے۔

پہلے شام سویرے اپنے اپنے کاموں سے آنے جانے والے لوگ یہاں چلتے چلتے ایک دوسرے سے علیک سلیک کرتے، مصافحے کرتے، بیٹا بیٹی کی شادیوں اور سسرال میں ہونے والے جھگڑوں اور بدسلوکیوں کے بارے میں مشاورت کرتے۔[۲۸]

مصنفہ ناسٹلجیا بیان کرتے ہوئے افسردہ ہو جاتی ہیں کہ ہم اپنی تہذیب و ثقافت کو بھول بیٹھے ہیں۔ حال اور ماضی کے کرداروں کے تقابل کو بیان کر کے وہ کرداروں کی سوچ کو بیان کرتی ہیں کہ آج کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ کسی کی خوشی غم سے فرق نہیں پڑتا۔ جب کہ ماضی میں سب کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے تھے۔ کرداروں کے تناظر میں ماضی کے افراد کی طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے۔

حال میں گلی میں دو طرفہ کوٹھیاں ہیں۔ ان لوگوں کا باہر کی زندگی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ ہمیشہ لمبی لمبی کاروں میں گھروں سے باہر نکلتے اور مزدور پیشہ افراد کی یاد صرف ضرورت کے وقت ہی آتی۔ مصنفہ کو اپنی گلی میں سبزی بیچنے والا شدت سے یاد آیا۔ ماضی میں سبزی والے کا کمیونی کیشن سسٹم بڑا مضبوط تھا۔ کسی نے سبزی لینی ہوتی یا نہیں لیکن گلی میں سب اس کے گرد سبزی دیکھنے ضرور اکٹھے ہوتے تھے۔ سبزی والا گلی کا اہم اور مرکزی کردار تھا۔

چھٹی کا دن ہوتا تو میں بھی اس کے گاہکوں میں شریک ہو جاتی۔ ان سے بھی جو اپنی ٹوکریاں، سلور کے تھال اور پلاسٹک کے فیتوں سے بنے تھیلے لے کر خریداری کو نکل پڑتیں۔ نوعمر، بوڑھی اور ادھیڑ عمر خواتین کے علاوہ بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کی بچیاں بھی اس کے خریداروں میں شامل ہوتیں۔ وہ سب کی سب ایک ہالہ سا بنا کر اس کی سائیکل کے گرد جمع ہو جاتیں۔[۲۹]

تمام خواتین گپ شپ لگانا شروع کر دیتی اور گلے شکوے کر کے فیصلہ اسی سے کرواتیں۔ یوں تو اس گلی، محلوں کے افواہوں، جھگڑوں، اسکینڈلوں اور اعتراضوں کی مکمل خبر ہوتی تھی اور کوئی بھی اس سے بور نہیں ہوتا تھا۔ ماضی کا کتنا خوبصورت وقت تھا۔ مصنفہ کو ماضی کی حسین یادیں یاد آتی ہیں اور ایسے لگتا تھا جیسے کسی مصور نے رنگوں سے معمور زندگی کی مکمل اور بھرپور تصویر بنائی ہو۔ مصنفہ نے ماضی کو بیان کر کے ان کے کرداروں کے ذریعے ان کی طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے کہ کس طرح وہ مکمل اور بھرپور زندگی گزارتے تھے۔ روایات، تہذیب و ثقافت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس حال میں سبزی والے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تمام لوگوں نے گھروں میں بڑے بڑے فریج رکھے ہوئے ہیں جن میں ہفتہ بھر کی سبزی لا کر رکھی ہوئی ہے۔ گلی میں کبھی نکل کر دیکھا ہی نہیں۔ اس لیے مصنفہ کو دکھ ہے کہ حال کے لوگوں کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہے جو بچے خبر کو پھیلایا کرتے تھے۔ وہ دوسرے ملکوں میں چلے گئے ہیں جو اس ملک میں ہیں۔ آپس میں ساتھ رہنے کے، پیار و محبت سے رہنے کے مقابلے پر اتر آئے ہیں۔ آج زندگی ویران اور تنہا نظر آتی ہے۔ گلی کی مجلسی زندگی، چہل پہل اور گہما گہمی واقعی کم ہو گئی ہے۔

گرما کی تاروں بھری راتوں میں یہ گلی کتنی آبادی ہو جاتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں کی گھٹن اور حبس سے گھبرا کر محلے کے لوگ (بستی یعنی کچی آبادی والے) باہر نکل آیا کرتے تھے۔ کیسی رونق اور گہما گہمی ہو جاتی۔ ہنسیاں، دل لگیاں، آپس کی چھیڑ چھاڑ، اسٹریٹ لیمپ تلے بیٹھ کر تاش کی، لوڈو کی بازیاں۔ یہ سب کتنا دلچسپ تھا۔[۳۰]

ماضی میں کتنی خوبصورت زندگی ہوا کرتی تھی۔ گرمیوں میں جب بجلی چلی جاتی تو تمام محلے والے چھتوں اور گلی میں نکل آیا کرتے تھے۔ بزرگ مختلف کھیل کھیلتے، خواتین مل کر گلے شکوے کرتیں۔ کتنا مضبوط کمیونی کیشن سسٹم تھا۔ بزرگوں کی عزت کی جاتی تھی لیکن اب سب کے گھروں میں پنکھے، کولر اور ائیر کنڈیشنر لگ گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ گلی میں نکلنا دور کی بات، ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ پرانے رشتے کچے سوت کے دھاگوں کی طرح ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن آج پھر ٹربائن کے پھٹ جانے کے تین دن بعد سب گھروں سے نکلے ہوئے ہیں۔ خبریں پھیل رہی ہیں، پانی جمع کیا جا رہا ہے، پہلے علاقے کو ہمارا علاقہ کہا جاتا تھا۔ اب فرد فرد کا علاقہ بن گیا ہے۔ مصنفہ کو لوڈ شیڈنگ پسند ہے اس کی وجہ سے سب اکٹھے تو ہوتے تھے۔ آج سب اکٹھے ہوتے ہیں لیکن کل نلکوں میں پانی آنے کے بعد سب پھر سے ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ سب اپنی نئی دنیا جس میں صوفے، قالینیں، فریج، ٹی وی اور وی سی آر ہیں۔ اس میں لوٹ جائیں گے۔

الطاف فاطمہ نے اس افسانے کے کرداروں کے تناظر میں ماضی کو بیان کرتے ہوئے حال اور ماضی کے لوگوں کی سوچ، طرزِ زندگی کو بیان کیا ہے۔ وہ بار بار ماضی کا حوالہ دے کر ایک خوب صورت زندگی کا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ جس کا آج کی زندگی سے کوئی لینا نہیں ہے۔ آج کا انسان اپنی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ وقت کی دوڑ میں خود بھی بھاگ بھاگ کر بہت آگے چلا گیا ہے جہاں وہ صرف تنہا اور اکیلا ہے جب کہ ماضی میں خوبصورت روایات تھیں۔ سب مل جل کر بیٹھتے تھے اور خود سے زیادہ دوسروں کا سوچتے تھے۔ غم کے موقع پر تمام گلے شکوے ختم کر کے اس کی دلجوئی کی جاتی تھی۔ جب کہ آج حسد کی وجہ سے سب ایک دوسرے کو سلام تک نہیں کرتے۔ مصنفہ نے اس افسانے میں ماضی کا حوالہ دے کر ہماری تہذیب و ثقافت، روایات کو بیان کیا ہے۔ جن کے گزر جانے کا مصنفہ کو شدت سے غم ہے اس لیے انھیں ماضی سے ایک خاص قسم کی انسیت اور لگاؤ ہے۔ اس لیے ان کا کردار حال میں مختلف اشیاء اور واقعات کو دیکھتے ہوئے ماضی کے تناظر میں چلی جاتی ہیں۔

افسانہ "ننگی مرغیاں" میں مصنفہ عہدِ حاضر کی عورت کا موازنہ قدیم عورت سے کرتی ہیں۔ انھیں مشرقی عورت پسند ہے اس لیے قدیم مشرقی معاشرے میں عورت کی وضع داری اور شرم و حیا سے بھی بہت متاثر ہیں۔ انھیں

نہ کرو۔۔۔ یہ بچے تو میرا رزق ہیں۔ میرے موتی دانے، میرے مچھلی دے کھیٹ، میری کنک دی فصل۔۔۔۔ [۳۲]

تانگے والا اپنے بچوں کی طرح تمام بچوں کی حفاظت کرتا لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ تمام لوگ بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ سب وقت کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہے کہ تانگے ختم کر دینے سے جو ایک رابطہ قائم تھا۔ وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ بس ڈرائیور اور تانگے والے کے کرداروں سے اس دور کی اور آج کے دور کی روایات کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز مختلف ہے۔ بس ڈرائیور کو وقت پر اگلے روٹ پر پہنچنا ہے۔ اسے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ بس میں کوئی سوار ہو گیا ہے یا کوئی سواری انتظار کر رہی ہے لیکن تانگے والا اپنا رزق سمجھ کر خود سے زیادہ بچوں کی حفاظت کرتا ہے۔

مصنفہ بس اسٹینڈ پر کھڑی ہے لیکن اسے گھوڑے کی ٹاپوں، ٹخ ٹخ کی آواز آ رہی ہے۔ دراصل الطاف فاطمہ نے اپنے بچپن میں ہمیشہ تانگے پر سفر کیا ہے۔ تانگے والے اور سواریوں کا آپس میں مکالمہ چلتا رہتا تھا۔ بچے بستے اٹھائے تانگے میں سوار ہوتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں، گدگدیاں کرتے ہیں اور بابا جی کبھی غصے میں آ کر ڈانٹ دیتا ہے۔ کبھی گنگنا تا ہے اور کبھی تو ماں بہن کی سنانے لگتا ہے۔ لیکن اس سب میں ایک اپنائیت تھی۔ گھروں میں سب مائیں، بہنیں کھانا تیار کرتی تھیں کیونکہ انھیں وقت کا معلوم ہوتا تھا لیکن آج کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے۔ وقت کی دوڑ میں بھاگ رہے ہیں۔ ہزاروں خبریں سنتے ہیں کہ بس نے بچے کو کچل دیا اور ہزاروں حادثات سننے کو ملتے ہیں۔ ماضی اور حال کی تہذیب و ثقافت کا بیان کرتی ہیں کہ کس طرح پہلے رشتوں میں اپنائیت ہوا کرتی تھی۔ سب کو عزت دی جاتی تھی۔ ماضی کا حوالہ دے کر حال اور ماضی کے کرداروں کی سوچ کو بیان کرتی ہیں۔ اس طرح ماضی کی اقدار کو سامنے لاتی ہیں کہ خود بخود ماضی سے انسیت اور لگاؤ کا تاثر ابھرتا ہے۔

اسی افسانے کے دوسرے حصے میں مصنفہ جب اپنی منزل تک پہنچتی ہے تو ہوٹل کے اس کمرے میں ٹھہرتی ہے جہاں انھیں مکمل جنگل نظر آ سکے۔ اس کی وجہ صرف ماضی ہے۔ کیونکہ مصنفہ ماضی میں گم ہو جاتی ہیں۔ جب انھیں سب کہتے ہیں کہ اچھا کمرہ چھوڑ کر یہ جگہ کیوں لی تو انھوں نے وہ کمرہ خاص مقصد سے لیا تھا۔ اس کمرے میں انھیں نہ صرف اپنا بچپن یاد آ رہا تھا بلکہ نظر بھی آ رہا تھا۔ اپنے ماضی میں، پاسٹ کے نوسٹلجیا میں چلی جاتی ہیں کہ یہاں سے انھیں جنگل کے مناظر صاف نظر آتے ہیں جہاں گل بی بی اور میم رہا کرتی تھیں۔ افسانے میں ماضی کے تناظر میں گل بی بی اور میم کا کردار ادا کیا گیا ہے۔ گل بی بی میم کے گھر پر کام کرتی تھی۔ ہر وقت لکھنے میں مصروف رہتی اور اکثر سوال کرتی کہ گاؤں کے لوگ جادو، ٹونے کرواتے ہیں۔ لیکن وہاں گاؤں میں سب جڑی بوٹیوں سے علاج کرواتے

تھے۔ فائدہ نہ ہو تو پیر فقیر سے تعویذ لکھوایا کرتے۔ گاؤں کی ماضی کی تہذیب بیان کی گئی ہے کہ پہلے لوگ جڑی بوٹیوں سے علاج کرواتے تھے۔

> ماریا میم صاحب کو دن رات یہی غم رہتا تھا۔ یہاں کوئی ہسپتال نہیں، کوئی ڈسپنسری نہیں۔ آخر لوگ کہاں تک جڑی بوٹیوں اور ٹوٹکوں پر گزر کریں۔ کم از کم ایک میٹرنٹی سنٹر تو کھل جانا چاہیے۔ صاف بات یہ ہے کہ ہم لوگ پہلے پہل اسے ڈاکٹری ہی سمجھتے تھے۔ اپنے دکھ درد اور زخم لیے پہنچ جاتے۔ وہ غریب روپڑتی تھی۔ ہاتھوں کے اشاروں سے کہتی تھیں۔ لیکن میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ [۳۳]

سب اسے تسلی دیا کرتے تھے اور پھر سب کام خیر خیریت سے ہو گئے اور آج حال میں ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ اللہ سے زیادہ ڈاکٹر پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں اور ماضی میں جڑی بوٹیوں سے علاج کر کے مریض شفایاب ہوتے تھے۔ حال اور ماضی کے کرداروں کے تناظر میں تہذیب و ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ طرزِ فکر، سوچ کے تقابل کو بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ ماضی کو پسند کرتی ہیں انھیں ماضی سے انسیت اور گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے دلکش یادوں میں گم ہو کر پر سکون ہوتی ہیں۔ ناسٹلجیا کے ذریعے فرد ماضی کی خوشگوار اور ناخوشگوار یادوں میں وقت گزار کے راحت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے حال کے آئینے میں ماضی کو دیکھتا ہے۔

"مشتِ غبار" افسانے میں مصنفہ انیکسی میں مقیم ہیں۔ وہ جب بھی دوسرے گھروں اور کوٹھیوں کو دیکھتی ہیں تو ماضی میں پہنچ جاتی ہیں۔ نوسٹالجک ہو کر ماضی کے بنے گھروں کو یاد کرتی ہیں۔

> پچھلے زمانوں میں باہر سے اتنی ٹیپ ٹاپ نہ ہوتی تھی۔ اندر سے باہر تک ایک لطیف ہمواری کے سوا کوئی چکا چوند اور خیرہ کرنے والی شے نہ ہوتی۔ ان کے جلو میں غریب غربا کے چھوٹے چھوٹے مکان بھی کھپ جاتے تھے۔ اس طرح کے علاقے کے آہنگ و توازن میں کوئی گربڑ پیدا نہ ہوتی تھی۔ احتیاج کی ایک صدا، دکھ کی ایک کراہ اور کبھی کبھی گہری خاموشی بھی پورے محلے کو باخبر اور یکجا کر دیتی تھی۔ [۳۴]

مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ پہلے محلوں کے نام ہوتے تھے۔ گلیوں کے بھی نام ہوتے تھے۔ لوگوں کے گھر بڑے ہوتے تو درمیان میں سے کھڑکیاں نکالی جاتیں تاکہ سب سے رابطہ کیا جا سکے۔ لوگ ہر حال میں ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ لیکن اب محلے کا نام ہی سننے کو نہیں ملتا۔ سب اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ مصنفہ ماضی کا حوالہ دے کر حال اور ماضی کے گھروں کا فرق بیان کر کے لوگوں کی سوچ کو بھی بیان کرتی ہے کہ ماضی میں کس طرح دوسروں کے بارے سوچا جاتا تھا۔ لیکن اب ایسی کوئی صورت حال نظر نہیں آتی۔ پہلے اونچے گھر ہونے کے باوجود رابطے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ قائم رہتا تھا اور اب سب اپنے گھروں میں مقیم ہیں۔ مصنفہ گھبرا کر جب باہر نکلتی ہیں تو زیادہ وقت بازار میں گزارتی ہیں۔ وہاں بھی ماضی کی طرح مٹی کے برتن تلاش کرتی ہیں اور برتن برتن دیکھتے پھر

ماضی کی یادوں میں کھو جاتی ہیں۔ آج کل مہنگائی کا دور ہے لیکن پہلے کرنسی کے بجائے اجناس کا تبادلہ کیا جاتا تھا۔ بازار میں فن ٹٹولا جاتا تھا جب کہ آج کے دور میں جیب گرم ہونی ضروری ہے۔

> ایوان میں سفید براق چاندنی کا فرش تھا۔ اس پر کاشانی قالین بچھا تھا۔۔۔ شہر کے محلوں اور گلی کوچوں کی آبادی کے ساتھ ساتھ ظل سبحانی نے یہ حکم صادر فرمایا کہ اجناس اور اشیائ کے بیوپاری اپنی اجناس کو پھیری لگا کر آواز اور صدا سے فروخت کریں تاکہ بیبیوں اور گرہستنوں کو اشیائے ضرورت گھر بیٹھے اور اپنی پسند سے مل جائیں۔[۳۵]

مصنفہ ہیجانی دور کو بیان کر کے ماضی کی تہذیب و ثقافت اور لوگوں کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر کو بیان کرتی ہیں۔ گھر بیٹھی خواتین کا بھی خیال رکھا جاتا تھا لیکن آج کل تو ہر طرف مارکیٹیں، شاپنگ پلازے نظر آتے ہیں۔ جہاں ہر طرف چمک دھمک نظر آتی ہے۔ اس چکاچوند چمک کے سامنے ظلِ سبحانی کے دور کی کوئی اہمیت نہیں۔

خواتین خود بازار جا کر شاپنگ کرتی ہیں۔ آج کل ہنر نہیں جیب دیکھی جاتی ہے۔ زندگی اور سوچ کا انداز بدل گیا ہے۔ مصنفہ اس دور میں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتی ہیں۔ انھیں دکھ ہوتا ہے کہ آج کل لوگ خود اپنی زندگیوں میں اتنے مگن ہو گئے ہیں کہ کسی کے دکھ، درد، تنہائی نظر نہیں آتی۔ وقت کی دور میں سب آگے چلے گئے ہیں۔ اس لیے مصنفہ بار بار خواہش کرتی ہیں۔

> کاش میں اس دور میں زندہ ہوتی جب دیواروں پر گھر تا گھر کھڑکیاں ہوا کرتی تھیں اور خوف یا الم کی ایک چیخ، درد و کرب کے عالم میں نکلی ہوئی ایک کراہ آن واحد میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سننے کو اس گھر میں جمع کر دیا کرتی تھیں۔ جہاں ان کی ضرورت ہوتی۔ بس ایک آن میں سارے فاصلے اور دوریاں طے ہو جاتیں۔ اونچی اور پختہ دیواروں کی ساری رکاوٹیں دھند کی طرح فضا میں تحلیل ہو جائیں۔[۳۶]

مصنفہ کا اپنا کردار ماضی کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ ماضی کا حوالہ دے کر ماضی کی تہذیب کے ساتھ طرزِ زندگی اور سوچ کو بیان کرتی ہیں۔ ایک فرد مشکل میں ہو تو ہزاروں ناراضگیوں کے باوجود سب اکٹھے ہو جاتے تھے۔ سارے فاصلے پل بھر میں مٹ جاتے تھے۔ کچے گھر ہونے کے ساتھ صاف دل ہوتے تھے۔ لیکن آج کل مرمر کی سلوں کے گھر ہوتے ہیں۔ لوگوں کی طرزِ زندگی بدلنے کے ساتھ ساتھ سوچ بھی اس قدر بدل گئی ہے کہ ماضی کی روایات کو اپناتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے یں لیکن مصنفہ ماضی کی روایات کو اپناتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتے ہیں لیکن مصنفہ کی ماضی کی روایات کو اس خوب صورتی سے بیان کرتی ہیں کہ دل سے عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس افسانے میں مصنفہ نرگس کا کردار بیان کیا ہے جو ہیجڑا ہے۔ مصنفہ کو اس بات کا دکھ ہے۔ لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان سے بات کرنا ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ آج کے دور میں بھی صاف اور سادہ دل رکھ کر سب کی خدمت کرتے ہیں۔ مصنفہ جب ان کو مانگتے دیکھتی ہیں تو وہ ماضی میں کھو کر اس لمحے کو یاد کرتی ہیں۔ جب انھوں نے زمانہ طالب علمی میں مانگے تانگے کے خلاف لکھا تھا۔ لیکن آج حال میں وہ مانگے تانگے کو برائی نہیں سمجھتی ہیں۔ اسی بہانے ایک دوسرے کی خیر خبر رہتی ہے لیکن آج کل کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے۔ سب لوگ دروازے بند گھروں میں مقیم ہیں۔ ایسے جیسے انسان ہیں۔ ہیرے جواہرات پڑے ہیں کیونکہ آج کے دور میں انسانوں سے زیادہ قیمتی جواہرات ہو گئے ہیں۔

نرگس کا کردار بھی ماضی کے تناظر میں موجود ہے۔ مصنفہ کی طرح حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں کھو جاتی ہیں اور مصنفہ سے ماضی کے چھوٹے چھوٹے قصے بیان کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے نوسٹالجک کو بری چیز نہیں سمجھا جاتا کیونکہ اس کے ذریعے انسان حال کی ناآسودگیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ماضی میں پناہ لیتا ہے اور ماضی کے خاکے اور نقشے ذہن میں ابھرتے ہیں۔

> لکھنؤ کے محلے اینچ خاں کے میدان میں اس کا گھر تھا۔ دو کمروں اور دالان والا۔ اس گھر کی کھپریل پر کدو کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ آنگن میں چھوٹی سی کوئیاں (کنواں) تھی۔ اس کی اماں کو صفائی ستھرائی کا خبط تھا۔ وہ کڑھی بہت اچھی پکاتی تھی۔[۳۷]

پرانے زمانے کے گھروں کی طرزِ تعمیر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ آج کل کوٹھیاں بنائی جاتی ہیں جب کہ ماضی میں کھلے کھلے گھر تعمیر کیے جاتے تھے۔ گھروں میں اضافی پانی جمع کرنے کے لیے کنواں کھودا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ نرگس اپنے ماضی کو بیان کرتے ہوئے ہمیشہ اداس ہو جاتی تھی۔ نرگس کو اس کی ماں نے پہلے لڑکا بنانے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہو کر لڑکی بنانے کی طرف توجہ دی۔ اس کی ماں ہمیشہ اسے ہیجڑوں سے چھپا کر رکھتی۔ لیکن ایک شادی میں اسے پسند کر لیا۔ کچھ عرصے بعد خود بھاگ کر یہ ان کی ٹولی میں شامل ہو گئی۔

نرگس کو یہ سوچ کر بہت خوشی ہوتی تھی کہ وہ فوج کا حصہ بھی تھی۔ جنگ عظیم دوم میں انگریزوں نے بہت سے لوگوں کو فوج میں بھرتی کیا تھا۔ انھیں صرف مجرا کرنے کے لیے بھرتی کیا گیا۔ جارجٹ کی ساڑھیاں باندھ کر بناؤ سنگھار کر کے ہمیشہ مجرا لگایا جاتا۔ میجر ویل ہمیشہ سے اسے پسند کرتا تھا اور کھلے ہاتھ سے دیتا تھا۔

> پیچھے ایک بیوی اور چار مہینے کا بیٹا چھوڑ کر آیا تھا۔ تصویریں جیب میں رکھتا تھا۔ میں ناچتی ناچتی تھک جاتی تو مجھے صوفے پر بٹھالیتا۔ میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے تصویریں دکھاتا۔۔۔۔ مگر بھاگوان کو اپنے ہالے کی دید نصیب نہ ہوئی۔ ایک رات اراکان پر زبردست غباری ہوئی تو میرا میجر اسی کی نذر ہو گیا۔[۳۸]

اس افسانے میں جنگ عظیم دوم کی صورت حال کے ساتھ ساتھ فوجیوں کو بیان کیا گیا کہ وہ ہمیشہ اپنے گھر والوں کو یاد کرتے تھے مگر بہت سے لوگ ان جنگوں کی نذر ہو گئے۔ کوئی بھی فوجی گھر سے واپس آتا تو ضرور کچھ نہ کچھ لاتا تھا اور سب مل کر کھاتے تھے۔ لیکن آج کل کوئی کسی کی خیر خبر تک نہیں لیتا، مل بیٹھ کر کھانا تو دور کی بات ہے۔ مصنفہ کو بخار کی حالت میں بھنگنوں کا خیال آتا ہے جو ہر گھر کی بیماری، دکھ سکھ سے دوسروں کو باخبر رکھتی تھیں اور لوگ ایک دوسرے کی خوشی غم میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن آج کے دور میں سب گھروں میں فاصلہ ہے۔ لوگ گھروں میں ریڈر، اخبار، ٹیلی ویژن سے خبریں سنتے ہیں اور اسی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ آس پاس کے لوگوں سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پہلے سب خلوص نیت سے ملتے تھے۔ کسی کے دل میں کوئی تعصب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ان لوگوں کے دفن ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب و ثقافت بھی دفن ہو گئی ہے۔

الطاف فاطمہ قدیم مشرقی معاشرے میں عورت کی وضع داری اور شرم و حیا سے بھی بہت متاثر ہیں۔ وہ جس تہذیبی پس منظر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس میں مشترکہ خاندانی نظام کو فروغ حاصل تھا۔ افراد خانہ کے درمیان باہمی محبت تھی اور اپنی خاندانی روایات سے محبت اور انسیت کے جذبات مثالی تھے۔ اس سب میں کوئی بھی اپنی روایات سے بغاوت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ افسانہ مچھلی میں انھوں نے مچھلی کے کردار کو اسی تناظر میں بیان کیا ہے۔ مچھلی کے کردار کے ذریعے اس پورے ماحول اور معاشرے کو بیان کیا ہے۔ مچھلی متوسط طبقے کی نمائندہ ہے۔ اس کے دل میں اپنی تہذیب و روایت سے لگاؤ ہے۔ اسے اپنے ماحول اور اپنی اقدار سے خاص لگاؤ موجود ہے۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی خاص اور اہم کمٹمنٹ کو توڑ کر اپنے ماحول اور اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہے اور بعد میں زندگی کے کسی موڑ پر پچھتاوے کا شکار نہیں ہوتی۔

اس افسانے کا مرکزی کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے دل میں اپنے بزرگوں کے لیے خاص عزت موجود ہے اور اپنے والدین کے سامنے کبھی بھی نہیں بولتا۔ گاڑی لے کر جب وہ کالج جاتا تھا تو اس کے والد نے اسے موٹر سائیکل پر جانے کو کہا تو وہ بخوشی کالج سائیکل پر جانے لگا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اچانک جب بازار میں مچھلی کو دیکھتا ہے تو اسے اس کے ساتھ گزارا وقت یاد آتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ وہ آج بھی اسی بس اسٹینڈ پر موجود ہے۔ جہاں سے وہ دونوں اکٹھے کالج جاتے تھے۔ جب اس نے مچھلی کو پرپوز کیا اور اس کے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کیا لیکن وہ نہ آئی۔ اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔

اس مقررہ تاریخ کو میں شام پانچ بجے سے گیارہ بجے رات تک بس اسٹینڈ پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ ایمان سے

اتنا احمق اور ہونق لگ رہا تھا۔ لوگ خاص طور پر بس اسٹینڈ کے ساتھ کے کھوکھے والے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔۔۔۔ میں نے گجرے خریدے تھے۔[۳۹]

مچھلی کو بھی یاد تھا کہ کس طرح اس نے اس کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کے لیے مکمل تیاری کر لی تھی۔ لیکن اس کے گھر اس کے تایا اپنے گھر والوں کے ساتھ آ گئے تھے اور اصل میز بانی تو پہلے دور میں ہی لوگ کیا کرتے تھے۔ اپنا سب کچھ مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ لیکن آج کل سب مہمانوں کے نام سے ہی دور بھاگتے ہیں۔ مصنفہ نے میز بانی کے حوالے سے اپنے گھر کا ماحول بیان کیا ہے کہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی۔

اماں جی۔ چھوٹے بھائی کو سبزی گوشت اور نہ جانے کیا کچھ لینے کو دوڑا چکی تھیں۔ مجھ سے چھوٹی بہن اور آپی۔۔۔۔ ہماری کزنز کے ساتھ مل کر بکسے ٹوکریاں اور تایا جان کا حقہ اندر لے جا رہی تھیں۔ گھر میں کیسی گہما گہمی آ گئی تھی۔ پورا گھر ہنسی اور محبت بھری باتوں سے بھر گیا تھا۔۔۔۔ وہ آ جائیں تو نہ دن دن رہتا ہے، نہ رات رات، باتیں، شرارتیں، چھیڑ چھاڑ، گپیں، تاش کیرم کی بازیاں لگ رہی ہیں، چائے تیار ہو رہی ہیں۔ گنے چوسے جا رہے ہیں۔[۴۰]

مصنفہ نے افسانے میں ماضی کی تہذیب و ثقافت، روایات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری کے دل میں ان روایات سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ماضی میں کوئی نمود و نمائش نہیں ہوتی تھی۔ غربت میں بھی مہمانوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ مہمانوں کی آمد کے بعد دن رات مختلف کھیل کھیلے جاتے۔ ان ہی روایات کے لیے مچھلی اپنی کمٹمنٹ توڑ کر اپنے والدین کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارتی ہے اور اسے کسی قسم کا کوئی ملال نہیں ہوتا۔

افسانہ شیر دھان میں مصنفہ نے ماضی کی ایک خوبصورت روایت کو پیش کیا ہے۔ جب سب کو کتابوں سے لگاؤ تھا۔ طالب علم پڑھائی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار دکاندار ہے۔ اس کے پاس ہر کتاب موجود ہوتی تھی۔ سب بچے وہیں سے کتابیں لیتے تھے۔ اس کے پاس ہر طرح کی کتابیں دستیاب ہوا کرتی تھیں۔ سب بچے اسے کتابوں والے سر کے نام سے یاد رکھتے تھے۔

آج ہر طرف ویڈیو گیمز کی دکانیں ہیں۔ درزیوں کی دکانوں پر ہجوم لگا رہتا ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ لوگوں کے شوق بھی بدل گئے ہیں۔ اسے ہمیشہ وہ وقت یاد آتا ہے جب اس کی دکان پر ہمیشہ رش لگا رہتا تھا۔

دکان کا تمام تر چارج کتابیں تلاش کرنے سے لے کر گلے میں پیسے ڈالنے تک کا عمل بچوں ہی کے ہاتھ میں رہتا۔ بیک وقت چار چار پانچ پانچ مل کر الماریوں کے اوپر تختوں پر بیٹھے ہوتے۔۔۔ کتابیں ڈھونڈ

رہے ہوتے ہیں۔ ساتھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ خود ہی کتابیں چھانٹ رہے ہیں یا پرانی کتابوں کی جلدیں باندھ رہے ہیں۔[۴۱]

وقت گزر گیا۔ وہی لڑکے جو خود کتابیں لیتے تھے۔ اب اپنے بچوں کے ساتھ کتابیں لینے جاتے ہیں اور ماضی کی باتیں بتاتے ہیں۔ وقت کے ساتھ بہت سی نئی دکانیں بھی کھل گئی ہیں۔ وقت کے سماجی اور معاشرتی رویوں میں تبدیلی آگئی ہے۔ جدید معاشرے میں کتب بینی سے دوری ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ کتابیں خریدنا اور پڑھنا ایک زمانے میں طالب علموں کی سب سے بڑی تفریح تھی اور اسی وجہ سے افراد کا رشتہ ادب اور تہذیب سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن آج بدلتی ہوئی سماجی ضرورتوں نے ہمیں ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ہم صرف آگے بڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں اور اس وجہ سے ہم اپنے علمی و ادبی ورثے سے یکسر بے خبر ہو گئے ہیں۔ اس افسانے میں ماضی کے ایک ایسے گوشے کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ جب اسکول کے تمام بچے کتابوں میں دلچسپی لیتے تھے۔

ارے بھائی ڈکشنری میں تلاش کرو۔ ڈکشنریاں، دیکھنا سیکھو۔۔۔۔ ڈکشنری دیکھو، لغت دیکھو بڑے کام کی چیز ہے۔ بچے آکسفورڈ ڈکشنریوں کے پاکٹ ایڈیشنوں پر ٹوٹ پڑتے۔۔۔۔ پھر اس سلسلے میں ڈکشنریاں بک بھی جائیں۔ دو ڈھائی حد تین روپے میں ڈکشنری ان کی جیب میں پہنچ جاتی۔[۴۲]

آج کے دور میں لڑکیاں صرف بال سیٹ کروانے میں مصروف رہتی ہیں۔ ریڈی میڈ چیزیں خریدتی ہیں۔ اس کے برعکس ماضی میں لڑکیاں انگریزی رسالے، کروشیا کے کام، کڑھائی بنائی کی کتابیں خریدا کرتی تھی اور اس میں دلچسپی لیتی تھیں۔ لیکن آج کے دور میں وہ تہذیب و ثقافت ملتی نظر آرہی ہے۔ یہ وقت شیر دھان ہے۔ ہر چیز کو کھا گیا ہے۔ افسوس کے ساتھ کتاب جیسے معصوم شے کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ تمام تہذیب و ثقافت مٹتی جارہی ہے۔ وقت نے پرانی روایات کو مٹا دیا ہے۔

وقت کی دوڑ میں انسان بھاگتا جارہا ہے۔ تلاش معاش اور ہوس زر کے ہاتھوں مجبور یہ انسان اپنے وجود کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب فرد کے ہاتھوں میں اپنی پہچان کے لیے کبھی ملازمت کی پرچی ہوتی ہے تو کبھی راشن کا کارڈ، کبھی مکان کے کرائے کی رسید۔ افسانہ نمانا جیسا آدمی میں بھی الطاف فاطمہ نے مصروف اور لایعنی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس مصروف زندگی میں انسان کی پہچان بہت مشکل ہے۔ اس دور میں انسان کی ہر بات اور ہر اشارہ مخصوص کوڈ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ نمانا جیسا بھی انھی کوڈز میں سے ایک کوڈ ہے۔ اس کی پہچان گلے میں چاندی کا میلا سا تعویذ ہے جس نے مرنے کے بعد بھی اس کی شناخت کو برقرار رکھا۔

میری نظر اس کے گلے میں پڑے تعویذ کی طرف اٹھ گئی۔ چاندی کا میلا سا تعویذ سیاہ ڈورے میں بلا ہوا تھا۔ میں نے انگلی تعویذ کی طرف اٹھائی اور معترض آواز میں کہا۔

یہ تعویذ آج کیوں ڈالا ہے گلے میں۔۔۔۔ واقعی میری نظر آج ہی اس تعویذ پر پڑی تھی۔ دفتر کا کام تھا ہی ایسا کہ ادھر کو دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ [۴۳]

حال میں سب اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ کسی کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ مصروف زندگی میں مگن ہے۔ اس وقت بھی وہ لوگوں کو سوال جواب کرتے دیکھ کر ماضی کی یاد میں گم ہو جاتی ہیں۔

بچپن میں چاندنی راتوں میں ہم ایک کھیل کھیلا کرتے تھے۔ سارے بچے گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایک کمر جھکی بڑھیا (وہ بچہ ہی ہوتا) لاٹھی ٹیکتی چاروں اور کچھ ڈھونڈتی کھوجتی گھیرے میں داخل ہوتی۔

بڑھیا۔ بڑھیا کیا ڈھونڈتی۔

بچے سوال کرتے۔۔۔۔ سوئی! جواب ملتے۔ پھر بچے سوال کرتے۔۔۔۔

بڑھیا جواب دیتی۔ [۴۴]

امن کی فاختائیں افسانے میں مصنفہ نے ماضی اور حال کے سماجی رویوں کو بیان کیا ہے۔ دنیا کی امن و شانتی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ شہر بانو حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں پہنچ جاتی ہیں۔ حال کے ہنگاموں سے گھبرا کر وہ ماضی کے اس گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ جب امن و سکون تھا۔ تمام بزرگ افراد اکٹھے رہتے تھے۔ درختوں کے سامنے میں تمام بزرگ مل جل کر باتیں کرتے تھے۔

بظاہر تو پانچوں خاندانوں کی بڑھیائیں اپنے جھریائے ہوئے چہروں اور سفید سروں کو کچھ اس طور پر تانے رکھتی تھیں۔ گویا ان کو ایک دوسرے کے خون لینے میں بھی باک نہ ہوگی اور تھا بھی یہی کہ بچوں پر ہونے والے جھگڑوں، لان کے مشترکہ نل پر ہونے والی نوکروں کی تکرار، دوسرے چھوٹے موٹے منافشوں میں سب سے آگے وہی ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے دل ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ [۴۵]

شہر بانو ماضی میں پہنچ کر اس کی طرزِ زندگی میں کھو جاتی ہے۔ جب لوگ بہت سادہ دل ہوتے تھے۔ بظاہر تو ہر وقت بات چیت کرتی رہتیں۔ ایک دوسرے کے عیب بیان ہوتے اور سب اپنے پوتے، پوتیوں، نواسے نواسیوں کے خلاف تھے۔ کہ یہ آج کی نسل پرانی تہذیب کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ فیشن کے طور پر سب کچھ بول رہے تھے۔ روز جھگڑے ہوتے لیکن پھر بھی سب اکٹھی بیٹھی نظر آتیں۔ سب اپنے دکھ درد بیان کرتی اور اپنے بڑھاپے کے درد بیان کرتیں تو باقی سب ٹوٹکے بیان کرتی۔ شہر بانو کو اس بات کا افسوس ہے کہ اب حال میں اونچے اونچے گھروں میں سب مقید ہیں۔ ایک گھر کی بڑھیا دوسرے گھر کی بڑھیا سے بات نہیں کر سکتی۔ ماضی کی طرح ایک دوسرے کو حکیم

کے ٹوٹکے، مرچیں پیس کر پینے کی ہدایت نہیں دی جا سکتیں۔ محلے کی دھوبن کے ماضی میں جو اسکینڈل بنتے تھے، اب نہیں بنے جا سکتے۔ آپس میں پوتوں نواسیوں کے اطوار بدلنے پر بھی بات چیت نہیں کی جا سکتی۔ پہلے سب مل جل کر رہتے تھے۔ اب ایسا کوئی منظر نظر نہیں آتا۔ مصنفہ نے خود ایسا ماحول دیکھا تھا جہاں مشترکہ خاندانی نظام تھا۔ لیکن آج کے دور میں بہت مصروف ہیں اور بزرگ گھروں میں اکیلے قید ہیں۔ ایسی طرزِ زندگی اور تہذیب کو مٹتے دیکھ کر مصنفہ کو دکھ ہوتا ہے اور اپنی تحریروں میں ماضی کو اس لیے زیرِ بحث لاتی ہیں کہ نوجوان نسل پھر سے ان اقدار کو اپنا سکیں اور ماضی دوبارہ زندہ ہو سکے۔

غیر ملکی لڑکی افسانے میں بھی مصنفہ نے ماضی کی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے جو اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ جمو جو دوسرے ملک سے پاکستان میں صرف اس لیے آتی ہے کہ اپنے ملک کے لڑکے سے شادی کرے گی۔ مگر یہاں پر آ کر اسے اپنا ملک اور گھر یاد آتا ہے اور ماضی کو بیان کرنے کے ساتھ وہ حال اور ماضی کے افراد کی طرزِ سوچ کو بیان کرتی ہے کہ اب لوگوں کی سوچ میں واضح فرق آ گیا ہے۔ ترقی اور فیشن کے دوڑ میں اپنی تہذیب و ثقافت کو بھول گئے ہیں۔

> اس کے دالان اور مخچیاں یاد آتے تھے اور پھر آنگن کی دیوار سے لگا ہوا بیری کا وہ مچھا درخت جس مُس کھٹے میٹھے بیر لگا کرتے تھے۔ سرخ زرد، سنہرے بیر جن کو سنسان دوپہروں میں وہ باریک پسے ہوئے نمک، مرچ کے ساتھ چٹخارے لے لے کر کھایا کرتی تھی اور پھر اوپر سے قلعی دار نقشین کٹورے میں بھر بھر کر ٹھنڈا پانی پیا کرتی تھی۔[۴۶]

مجو جب پاکستان آئی تو یہاں کے افراد، ان کے رویے، طرزِ زندگی اور سوچ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتی۔ ماضی میں اینٹوں سے بنے بنگلے میں رہتے ٹیبل فین چلا کرتا۔ لیکن آج بڑی کوٹھی، ائیر کنڈیشن کمرے اور کمرے میں ٹیلی فون۔ وقت کی دوڑ میں سب وقت کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ پاکستان کو امریکہ بنا لیا ہے۔ مجو کو ہمیشہ انگریزی فلمیں دیکھنے کے لیے کسی لڑکے کے ساتھ بھجوایا جاتا۔ سب لڑکیاں فیشن سے بال کٹواتی۔ مجھو نے ہمیشہ پاکستان میں سادگی کے بارے میں سنا تھا۔ دراصل مصنفہ نے کرداروں کے رویے اور سوچ سے حال کے لوگوں کی صورت حال بیان کی ہے کہ کس طرح فیشن کے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو مکمل طور پر نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ الطاف فاطمہ معاشرے کی حساس فرد تھیں۔ انھوں نے ماضی اور حال میں لوگوں کے رویوں اور سوچ میں تضاد کو نہ صرف دیکھا بلکہ محسوس بھی کیا اور اپنی تحریروں میں بیان کیا۔

چھوٹے آدمی افسانے میں مصنفہ نے ملک سعید کا کردار بیان کیا ہے۔ ملک سعید اچانک جب کسی بونے آدمی کو دیکھتے تو اپنا ماضی یاد آ جاتا کیونکہ وہ چھ فٹ اور ساڑھے تین انچ کا انسان تھا اور اس کے لیے کپڑے بنانے کے لیے بھی اس

کے والدین کو بہت سی مشکلات پیش آتیں اور ہمیشہ سے ملک سعید کو چھوٹے آدمی پسند تھے۔ بونے کو دیکھ اسے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے۔

> اسے چلتے پھرتے یہ آس رہنے لگی کہ کسی کونے کھدرے میں کسی دن کوئی ننھا سا، ننگا منگا باشتیا سردی میں تھر تھر کانپتا مل جائے گا۔ بس وہ جھپاک سے اس کو اپنی کوٹ کی جیب میں چھپالے گا۔ اپنی بہن کے گڈے کے کپڑے چرا کر اس کو پہنا کر بابو بنالے گا اور گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔[۴۷]

زادِ سفر افسانے میں غلام حسین جب سفر کرتے کرتے اپنے آبائی گاؤں کے پاس سے گزرتا ہے تو اپنا گزرا ماضی، بچپن کا ماحول سب یاد آتا ہے جو بانو کی شادی کے بعد وہ چھوڑ آیا تھا۔ گل بانو اور غلام حسین ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے لیکن نور بانو ایک مشرقی لڑکی اور دیہاتی ماحول میں رہنے والی لڑکی تھی۔ معاشرے کے رسم ورواج اور والدین کی عزت کی خاطر وہ غلام حسین کو چھوڑ کر اپنے والدین کی پسند سے شادی کر لیتی ہے تاکہ اس کی وجہ سے اس کے والدین کو شرمندگی نہ ہو۔ غلام حسین جب نور بانو کے گاؤں میں داخل ہوتا ہے تو گاؤں کا رہن سہن، بچپن کی یادیں اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ گاؤں کی تہذیب جہاں میدان میں مرغیاں اور دروازے پر بھینس کھڑی ہوتی۔ صاف اور بکھری ہوئی دھوپ صحن میں آتی۔ نلکے سے نہایا جاتا اور تازہ دیسی گھی اور مکھن سے کھانا تیار ہوتا۔ ہر طرف پاکیزہ ماحول تھا۔

> جس کی دلاور کے ساتھ شادی کا سن کر وہ اتنا رویا تھا کہ اس کی آنکھیں اور بھی موٹی ہوگئی تھی اور جن کو چھو کر نور بانو نے تو سرگوشیوں میں اس سے کہا تھا۔ یوں تو تمھاری آنکھیں اور بھی موٹی ہوگئی تھیں۔ مگر اب تم نہ رو۔ اب تم مجھے جانے دو کہ میں سب سے چھپ کر آئی ہوں۔ وہ لوگ مجھے تیل چڑھانے اور کنگھا باندھنے آتے ہیں۔[۴۸]

نور بانو کو اپنی کمٹمنٹ توڑنے پر ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔ اسے اپنی روایت سے پیار تھا اور والدین کی عزت کی خاطر خاموش رہی اور آج مکمل اور پر سکون زندگی گزار رہی۔ مصنفہ خود بھی مشرقی ماحول سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لیے اپنی تحریروں میں زیادہ تر اسی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا ہے اور کردار اپنے زمانے، رسم ورواج سے مطابقت رکھتے ہیں۔ نور بانو آج اپنے بچوں اور زندگی کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے رویے سے کسی قسم کا ملال اور پچھتاوا ظاہر نہیں ہوتا۔

گواہی آخر شب کی میں مصنفہ نے پاک فوج جنگ کے حالات کو بیان کیا ہے۔ مصنفہ ہندوستان میں رہتی تھیں۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے خود ہجرت کے مناظر، لوگوں کے درد کو دیکھا تھا اور اس درد کو محسوس کر کے انھوں نے اپنی تحریروں میں بیان کیا۔ کس طرح بارڈر پر دونوں طرف سے حملے کیے گئے اور ان کے گھر والوں نے کتنی

قربانیاں دیں۔ کس طرح فوجیوں پر گولے برسائے گئے۔ انھیں خوراک کی قلت کی وجہ سے پتے کھا کر گزارا کرنا پڑا۔ افسانے میں مرکزی کردار زبیر کی والدہ جب اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھتی ہیں تو انھیں اپنے شوہر کا آخری خط یاد آتا ہے جو انھوں نے عید سے پہلے بھجوایا تھا۔ اس طرح وہ ماضی کی یاد میں گم ہو جاتی ہیں۔

> سورج غروب ہو رہا ہے۔ اندھیرے پھیل رہے ہیں۔ اپنے اندھیرے مورچے میں ابھی ابھی عید کا چاند نظر آنے کی خبر ملی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اپنے ملک اور وطن کی سلامتی کی شدید فکر ہو گی۔۔۔ ہم آخری سانس تک اس کی سلامتی اور آزادی کے لیے اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ کل انشاءاللہ آپ سب اور ہم لوگ بھی عید منائیں گے۔ میرے بچوں کو بہت اچھی سی عید منوانا۔[۴۹]

انسان ہمیشہ سے اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے اور اپنے حال کو ماضی کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ ماضی کے احساسات، یادیں اچھی ہوں یا بُری، خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، سے دامن چھڑانا ممکن نہیں ہوتا اور بعض انسان تو جیتے ہی ماضی میں ہیں۔ اپنے حال میں ماضی کو تلاش کرتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حال میں ماضی کی اقدار، تہذیب و ثقافت اور روایت کو ختم ہوتے دیکھتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ ادیب ویسے معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے۔ وہ اس چیز کو زیادہ محسوس کرتا ہے اور اپنی تحریروں میں بیان کرتا ہے۔

الطاف فاطمہ معاشرے کی حساس فرد ہیں۔ حال کے کردار جب ماضی کی روایات کو نظر انداز کرتے ہیں تو مصنفہ ماضی میں ان تہذیبی روایات کو تلاش کرتی ہیں۔ کرداروں کے رویوں کو اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں کے کرداروں میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ حال اور ماضی کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر میں واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا انسان شناخت کی گمشدگی کے المیے سے دوچار نظر آتا ہے۔

موجودہ دور کا یہ انسان محض اپنی تہذیبی اقدار سے ہی دور نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی سرزمین اور اپنے ماحول سے بھی دور ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ اجنبی دیار میں اجنبی چہروں کے درمیان اجنبی زبانوں کے بھنور میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس ساری صورت حال کے نتیجے میں اس کی اپنی شناخت کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنی ذات کے اندر سکڑتا جا رہا ہے کیونکہ باطنی طور پر اس کی پوری ذات انتشار کا شکار ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گزشتہ کل سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی اپنی شناخت گم ہو گئی ہے۔ یہ دکھ اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ شناخت کے گم ہو جانے کے المیے کو الطاف فاطمہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور اپنے افسانوں کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں نظریۂ حیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی بنیادی صداقتوں کو اس طرح سے بیان کرتی ہیں کہ فنی لطافت کے ساتھ ان کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

الطاف فاطمہ کی تحریروں میں ہمیں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے ناسٹالجک ہو کر ماضی اور حال کا تقابل پیش کرتے ہوئے بنیادی انسانی قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم تہذیب میں انھیں شرم و حیا، لحاظ، تعلیم کی پڑھے لکھے لوگوں کی قدر و قیمت، بزرگوں کی عزت، بیمار، کمزور، بے بس اور غریب افراد کی دل سے عزت اور مالی طور پر مدد اور احساس نظر آتا ہے۔ بلند معیاراتِ زندگی، جدید فیشن اور بے حسی سے متعلق سوچ و فکر کم تھی۔ دولت سے زیادہ انسان کی اہمیت تھی۔ بزرگوں کی ہر بات کو دل سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ انسانی رویوں اور احساسات کو محسوس کرتے تھے لیکن آج جدیدیت کے دور میں انھی کرداروں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ وقت کی دور، فیشن کے گھن چکر میں ان سب تہذیبی روایات اور اقدار کو بھول گئے ہیں۔ ان سب کو بیوقوفانہ خیال سمجھتے ہیں۔ انھیں ابھی ذات کے خیال میں کوئی واضح خیال نہیں ہے کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ان کا مستقبل کیا ہے۔ وقت کی دوڑ میں کیا کچھ کھو چکے ہیں۔ دولت، مادیت کے دور نے انسانی قدروں کو ان کے دلوں سے مٹا دیا ہے۔ ادیب ہمارے معاشرے کے حساس فرد ہوتے ہیں۔ عام فرد سے زیادہ ان چیزوں کو محسوس کرتے اور اپنی تحریروں میں بیان کرتے ہیں۔ اس لیے مصنفہ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور انسانی تہذیب و ثقافت، تہذیبی رویوں، انسانی قدروں کو حال اور ماضی کا تقابل کر کے بیان کیا ہے کہ کس طرح سے ہم وقت کے پیچھے اور مادی چیزوں کے پیچھے بھاگ کر ماضی سے جان چھڑوا رہے ہیں لیکن الطاف فاطمہ نے ماضی اور حال کا تقابل کر کے ماضی کی روایات، تہذیبی قدروں کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ان سب کی دل سے عزت کرنے کو جی چاہتا ہے اور انسیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ناسٹلجیا کا یہ رجحان، رویہ دراصل انسانی محبت اور رفاقت کی تلاش کا ایک سفر ہے جس پر چل کر کچھ لمحے سکون اور اطمینان سے گزار سکتے ہیں۔ رفاقت کی یہ ٹھنڈی چھاؤں اور خوشبو ایک دھیمے ساز کی مانند روح کو آسودگی اور طمانیت کے احساس سے دوچار کرتی ہے۔ ان کی تحریریں ہر دور میں تہذیب و ثقافت کو سمجھنے میں معاون و مددگار رہیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ الطاف فاطمہ، تار عنکبوت (لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء)، ص ۸۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۴۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۵۸۔

۷۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۸۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۹۔ ایضاً، ص ۶۸۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۱۵۔ الطاف فاطمہ، وہ جسے چاہا گیا (لاہور: دی مکتبہ اردو ڈائجسٹ)، ص ۴۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۳۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۰۔

۲۳۔ ایضاً، ص۱۴۱۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۲۶۔ ایضاً، ص۸۲۔

۲۷۔ الطاف فاطمہ، جب دیواریں گریہ کرتی ہیں(کراچی: دی سمیع پرنٹرز، ۲۰۰۳ء)، ص۱۰۔

۲۸۔ ایضاً، ص۱۱۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۲۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۶۔

۳۱۔ ایضاً، ص۲۵۔

۳۲۔ ایضاً، ص۶۶۔

۳۳۔ ایضاً، ص۸۰۔

۳۴۔ ایضاً، ص۹۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص۹۹۔

۳۶۔ ایضاً، ص۱۰۲۔

۳۷۔ ایضاً، ص۱۰۸۔

۳۸۔ ایضاً، ص۱۱۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۳۔

۴۰۔ ایضاً، ص۱۳۷۔

۴۱۔ ایضاً، ص۱۶۲۔

۴۲۔ ایضاً، ص۱۶۴۔

۴۳۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۴۴۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۴۵۔ الطاف فاطمہ، گواہی آخر شب کی(لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص۱۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص۱۴۔

۴۷۔ ایضاً، ص۲۹۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۲۴۔

۴۹۔ ایضاً، ص۱۶۹۔

ماحصل

ماحصل

اردو ادب کی تمام اصناف میں افسانے کو اہم مقام حاصل ہے۔ افسانہ اس لیے دوسری تمام اصناف سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے۔ ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد۔ مختصر یہ کہ ایک افسانے میں سب کچھ ایک ہی ہوتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے اختتام پر قاری کے ذہن پر واحد تاثر قائم کرتا ہے، وحدتِ تاثر کہلاتی ہے۔

تقسیم پاکستان کے بعد افسانے میں معاشرتی، معاشی، سیاسی اور مذہبی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے میں افسانے میں بھی مختلف رجحانات نے جگہ پائی۔ اُن میں سے ایک اہم رجحان "ناسٹلجیا" ہے۔

ناسٹلجیا سے مراد ماضی پسندی ہے۔ اسے ماضی کے شدید احساس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح نفسیاتی، ذہنی امراض میں مبتلا مریضوں کا علاج کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں مریض اپنے ماضی کی کرب ناک یادوں میں مبتلا ہو کر حال میں ماضی کو تلاش کرتا ہے۔ حال کی ناآسودگی سے تنگ آکر ماضی کی طرف سفر کرنے کی خواہش جب شدت اختیار کر جائے تو انسان ماضی کی خوش گوار یا ناخوشگوار یادوں میں وقت گزارنے میں راحت محسوس کرے تو اس کیفیت کو ناسٹلجیا کا نام دیا جاتا ہے۔

انسان اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہے۔ ماضی سے اس کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ نفسیات میں اسے ایک بیماری کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ ماضی میں گھر سے دور رہنے والے سپاہی وطن یا گھر واپس جانے کی شدید خواہش کے نتیجے میں دل شکستگی اور اداسی کا شکار ہو جاتے تھے۔ گزرے پل اور جڑوں سے کٹ جانے کا نتیجہ ناسٹلجیا کی شکل میں نکلتا ہے۔ یوں ناسٹلجیا ایک اہم موضوع ہے۔ ہر فرد کے اندر ناسٹلجیا موجود ہوتا ہے۔ دورانِ تحقیق میں ایک کالج میں پڑھا رہی تھی اور جب بھی کالج کی طلباء اور ان کی دوستی کو دیکھتی تو مجھے اپنے کالج کا گزرا وقت یاد آجاتا۔ یوں میں بھی حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں کھو جاتی۔

یہ بیماری زیادہ تر ان افراد کے ہاں نظر آتی ہے جنھوں نے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کی ہو یا پھر اپنے گھر، وطن سے دور ہوں۔ ناسٹلجیا کا سبب محض ہجرت ہے۔ تقسیمِ پاکستان کے بعد بہت سے لوگوں نے برصغیر سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت کے باوجود وہ اپنے ماضی کو نہ بھول سکے۔ وہ اور شدت سے ماضی کو یاد کرتے اور اپنے ماضی میں کھو کر اپنے بچپن، گزرے پل کو یاد کرتے۔ ادیب ہمارے معاشرے کے

احساس فرد ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس چیز کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں میں بیان۔ اس لیے اس موضوع کی اہمیت کی مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد ان سوالات پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کی پیش کش اور نوعیت کیا ہے؟

۲۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں واقعات کی پیش کش میں ناسٹلجیا کو کیسے بیان کیا گیا ہے؟

۳۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں کرداروں کی پیش کش میں ناسٹلجیا کو کیسے جانچ سکتے ہیں؟

ان سوالات کی بنیاد پر اس مقالے کو لکھا گیا ہے۔ مقالہ لکھتے ہوئے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ تمام سوالات کے جوابات ڈھونڈے جا سکیں۔ ناسٹلجیا کو بیان کرتے ہوئے پس منظر پس منظر کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس لیے پہلے باب میں ناسٹلجیا کو بیان کیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ناسٹلجیا کے مختلف معنی اور مفہوم کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں سے چند ایک "وطن یا گھر سے دور، وطن جانے کی خواہش، ماضی کی حسرت ناک یادیں، ماضی کی یاد دلانے والی اشیاء، خود کو دہرانے کی خواہش وغیرہ ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ناسٹلجیا کا سبب محض ہجرت ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ہجرت کی وجہ سے ہی ناسٹلجیا نظر آتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے عوامل فرد کو ناسٹلجیک بناتے ہیں مثلاً کسی خواہش کا پورا نہ ہونا، توقعات کے خلاف واقعات کا وقوع پذیر ہونا، حساسیت، غم زدہ ہونا، بیرونِ ملک کسی بھی کام، ملازمت یا حصولِ علم کے لیے جانا، دوستوں اور اپنے قریبی عزیز، رشتہ داروں سے بچھڑ جانا، ایک جگہ سے ہمیشہ کے لیے دوسری جگہ جانا وغیرہ۔ یہ تمام وجوہات بھی ناسٹلجیا کا باعث بنتے ہیں۔ اس لیے اس مقالے میں ان تمام وجوہات اور صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناسٹلجیا کی مختلف صورتیں ہیں جن میں ماضی کی یاد، یادِ وطن کا عارضہ، مالیخولیا، وطن واپسی کی شدید خواہش، داخلی خود کلامی، جڑوں کی تلاش، حسرت ناک یادیں، احساسِ زیاں یا خوابوں میں زندہ رہنے کی خواہش وغیرہ شامل ہے۔

اردو ادب میں قیامِ پاکستان سے پہلے ناسٹلجیا کو کس انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کن کن ادیبوں کے ہاں ہمیں ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ آزادی سے پہلے کرشن چندر، عزیز احمد، عصمت چغتائی اور ڈاکٹر احسن فاروقی لکھ رہے تھے اور آزادی کے بعد اس سفر میں قابلِ ذکر مصنفین قراۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، انتظار حسین، عبد اللہ حسین، غلام الثقلین نقوی، جوگندر پال منٹو، پریم چند، احمد ندیم قاسمی وغیرہ شامل ہوئے۔ ان تمام ادیبوں نے اپنی تحریروں میں ناسٹلجیا کے رجحان جس میں رومانوی رجحان، حقیقت پسندانہ رجحان، تہذیبی رجحان، علامتی اور استعاراتی رجحان، جنسی اور نفسیاتی رجحان پاکستانی معاشرے کی نان فکشن رجحان، تجرباتی رجحان، خود سوانحی رجحان، فکابی رجحان، رومانی و عشقیہ رجحان وغیرہ شامل تھے۔

تقسیمِ ہند سے پہلے اردو ادب میں ناسٹلجیا نظر آتا ہے لیکن زیادہ واضح طور پر تقسیمِ ہند کے بعد ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ ہجرت کر کے آئے تھے۔ اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس ناسٹلجیا کے شدید دور سے گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کر کے آنے پر انھیں اپنا پرانا گھر شدت سے یاد آتا۔ بچپن کے دوست یاد آتے اور بعض اوقات یہ ناسٹلجیا شدت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ناسٹلجیا زیادہ تر قراۃ العین حیدر، انتظار حسین اور الطاف فاطمہ کے ہاں نظر آتا ہے۔ ناسٹلجیا صرف افسانوں میں ہی نہیں بلکہ ناولوں، شاعری، ڈراموں اور فلموں وغیرہ میں بھی نظر آتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کرنے کی وجہ سے حالت ایک دم بدل گئی۔ ہجرت صرف پاکستانیوں نے ہی نہیں کی بلکہ تبت سے ہندوؤں نے پاکستان سے ہندوستان اور مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ اس لیے ہجرت کی وجہ سے وہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ بے جڑ لوگ ہیں وہ بے یقینی کا شکار ہو گئے اور یہی بے جڑی اور بے یقینی کی کیفیت ناسٹلجیا کا سبب بنی اور افسانہ نگاروں نے اس کو موضوع بنایا اور اس پر لکھا۔ اس مقالے کے پہلے باب میں ناسٹلجیا کا پس منظر، مختلف صورتیں، رجحانات، وجوہات اور ادیبوں کی تحریروں میں ناسٹلجیا کو بیان کیا گیا ہے۔

الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ناسٹلجیائی رجحان شدت سے نظر آتا ہے۔ س لیے میرے مقالے کا دوسرا باب الطاف فاطمہ پر ہے جسمیں الطاف فاطمہ کی حالاتِ زندگی، تعلیم و ملازمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے نہ صرف افسانوں بلکہ ناولوں میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ ناسٹلجیا کیوں نظر آتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی ہجرت کے کرب کو دیکھا تھا۔ اپنی آنکھوں سے ہجرت کے تمام مناظر دیکھے۔ اس لیے ناسٹلجیا شدت سے نظر آتا ہے۔

اس مقالے کے تیسرے باب میں دوسرے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں واقعات کی پیش کش میں ناسٹلجیا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انھوں نے جس معاشرے میں بچپن گزارا۔ وہاں سب مل جل کر رہتے تھے۔ سب کو ایک دوسرے کا خیال ہوتا تھا لیکن جب آج کے معاشرے میں سب الگ تھلگ رہتے ہیں۔ کسی کو کسی کا خیال نہیں ہے۔ ایک ہی محلہ میں رہتے ہوئے کسی کو کسی کی خبر نہیں۔ اس لیے الطاف فاطمہ مختلف واقعات کے ذریعے حال اور ماضی کا موازنہ کرتے ہیں۔ حال میں ہوتے ہوئے ماضی میں گم ہو جاتی ہیں کیونکہ انھیں ماضی کی روایات، اقدار سے انسیت تھی۔ اس لیے موجودہ معاشرے کو دیکھ کر انھیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ روایات بالکل ختم ہو رہی ہیں۔ ترقی کی طرف قدیم بڑھاتے ہوئے روایات سے ناطہ توڑ رہے ہیں۔ اونچی اونچی کوٹھیوں میں رہتے ہوئے بھی گلی میں قدم نہیں رکھا جبکہ پہلے گھر کی دیواریں اونچی ہونے کے باوجود جڑی ہوتی تھیں، درمیان

میں کھڑکی ہوتی تھی کہ رابطہ قائم کیا جاسکے۔ لیکن آج جب اس کے الٹ صورت حال سامنے آتی ہے تو الطاف فاطمہ مختلف واقعات کے ذریعے ناسٹلجیا کو بیان کرتی ہیں۔ ماضی کو بیان کرتی ہیں۔

الطاف فاطمہ کے چار افسانوی مجموعے ہیں اور چاروں میں ہمیں مختلف واقعات کے ذریعے ناسٹلجیا نظر آتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ اس وقت ہجرت کے بعد کی صورت حال تھی۔ پاکستان کو بنے کچھ عرصہ گزرا تھا۔ اس وقت ہجرت کا غم تازہ تھا۔ اس لیے زیادہ تر وہ ہجرت کے واقعات بیان کرتی ہیں اور اسے بیان کرنے کی خوشی اور مسرت محسوس کرتی ہیں اس میں رجائی انداز نظر آتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کی زندگی میں ایک سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر انتشار اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ اس وقت افسانے کا موضوع انقلاب اور اس کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی شاخسانے تھے۔ یہ ایک المناک سیاسی حادثہ تھا۔ ادیب ہمارے معاشرے کے حساس فرد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں اخوت اور محبت کے رشتوں کا ٹوٹنے اور بکھرنے کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ نقل مکانی، قتل و غارت، بھوک اور افلاس نے انسانی قدروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ فسادات کی گرد نے پورے اردو ادب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ادیبوں نے اپنی تحریروں میں اپنے اپنے انداز سے ہجرت کو بیان کیا۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں بھی ہمیں ہجرت کے موضوعات نظر آتے ہیں۔ ہجرت کے بعد الطاف فاطمہ ماضی اور حال کا تقابل اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں۔ جدید اور قدیم تہذیبی و ثقافتی اقدار کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں برصغیر پاک و ہند کی قدیم ثقافتی اقدار بھی نظر آتی ہیں اور اس کے مقابل جدید دور کی تیز رفتار زندگی کا احوال بھی نظر آتا ہے۔ کسی طرح مادیت کی خواہش کے پیچھے انسان بھاگتے ہوئے نہ صرف اپنے ماضی بلکہ ماضی کی اقدار و روایات کو بھی بھول گیا ہے۔ آج کا معاشرہ تہذیبی بحران کا شکار ہے۔ نئے دولت مند طبقے کی زندگی کے کھوکھلے پن کو بیان کیا ہے۔ نئے اور پرانے دونوں نسلوں کے جذباتی اور ذہنی مسائل کا تجزیہ ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں موجود احساسِ تنہائی، ملال، دکھ اور صنعتی معاشرت کا خوف ملتا ہے۔ احساسِ تنہائی کی وجہ سے خود کلامی کا انداز نظر آتا ہے۔

الطاف فاطمہ ناسٹلجیا کرداروں کے تناظر میں پیش کرتی ہیں تو ان کی تخلیقات میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے کردار نظر آتے ہیں۔ وہ کردار جو ماضی کی روایات کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ماضی میں انھی اقدار کی وجہ سے ان کی عزت کی جاتی تھی۔ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج حال میں ان قدروں کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو اپنانے والوں کو قدامت پسند کہا جاتا ہے۔

تمام کرداروں کو انسانی نفسیات کے قریب رکھ کر تخلیق کیا ہے۔ ان کے کرداروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں عوام الناس کے اندر رہ کر تخلیق کیا گیا ہے۔ حقیقی زندگی کے کردار ہیں۔ انھوں نے زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی ہے کہ شہروں اور گلیوں سے مجلسی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ وہ لوگ جو ایک خبر کو جلدی سے پھیلا دیا کرتے تھے۔ وہ خبر اب پیدا ہونے سے پہلے سے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے اور یہی بدلتا ہوا زمانہ انھیں پریشان کرتا ہے۔ بدلتی ہوئی بستیاں، طبقات کا فرق، محلے کی سیاست، مجلسی زندگی کی چہل پہل اور ایک جیتا جاگتا محلہ ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

مقالے میں الطاف فاطمہ نے واقعات کو بیان کرنے میں ترتیب و تسلسل کو مد نظر رکھا ہے۔ واقعات کا ترتیب سے بیان کرنا ان کی تحریروں کی اہم صفت ہے۔ حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ تمام واقعات کو ابتدا سے اختتام تک ایک تسلسل اور دلچسپی سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنی ذات سے وابستہ حالات و واقعات کو ترجیح دینے کے ساتھ ان مصدقہ واقعات کو بھی تحریر کا حصہ بنایا گیا ہے جو ہجرت تقسیم کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی تحریریں بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر پذیری کا امتزاج ہیں۔ واقعات کی سچائی کو ان کی تحریروں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تحریر کا ہر پہلو حقائق اور دلائل کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ یوں ہمیں بہت سے ہجرت کے واقعات اور ماضی کی تہذیب و ثقافت، روایات اور اقدار کو جاننے میں رہنمائی ملتی ہے اور ان سب چیزوں کو بیان کرتے ہوئے ماضی اور حال کا تقابل بہت خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ کہیں کہیں پر جذباتی بھی ہو جاتی ہیں۔ تحریروں میں اپنے ذاتی تجربات، احساسات، خیالات اور پیش آنے والے واقعات کو بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ماضی کو بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں اپنے عیسائیوں کے ساتھ تعلق، جذبات کو بیان کیا ہے جو آج حال میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

مصنفہ کو مشرقی تہذیب و ثقافت سے انسیت تھی اور اس قدر خوب صورت انداز سے پیش کیا ہے کہ ان لگاؤ، اقدار کی دل سے عزت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حال میں بزرگوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ ان کی باتوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ نوجوان نسل ترقی کی دوڑ میں اپنی روایات کو بھول گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور اہم مسئلہ کہ آج کی نوجوان نسل کا کتابوں سے تعلق ختم ہو گیا ہے۔ وہ کتابوں سے زیادہ میڈیا کو ترجیح دیتا ہے اور یہ ہمارے معاشرے کی ایک بہت بڑی حقیقت اور المیہ ہے۔ وقت کے بدلنے سے سماجی اور معاشرتی رویوں کے بدلنے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

افواج پاکستان ہجرت کے واقعات اور زخمی افراد کے واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ کس طرح فوجی گھروں

سے دور چلے جاتے ہیں اور پھر اپنے گھر والوں کو خطوط کے ذریعے آگاہ کرے ت ہیں۔ ہر خوشی غمی کے موقع پر دوستوں کو یاد کرتے ہیں۔

کردار و واقعات کے حوالے سے بھی اس مقالے میں الگ الگ باب میں جائزہ لیا گیا ہے اور مثالوں کے ذریعے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے کردار کس طرح وقت اور حالات سے گھبرا کر ماضی میں پناہ لیتے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے میں ایک اہم مسئلہ جو ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ تلاش، معاش اور ہوس زر کے ہاتھوں مجبور انسان اپنے وجود کو کس طرح مختلف سانچوں میں ڈھال رہا ہے۔ اس کے وجود رشوت کے بغیر اسے نوکری ملنا مشکل ہے۔ مقالے میں حال سے ماضی کی طرف لوٹنے کی خواہش کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ماضی کی خوب صورت یادیں، خوبصورت واقعات ان کی تحریروں کا حصہ ہیں۔ اس حوالے کے لیے ان کے افسانوی مجموعوں اور تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کی بھانجی کا انٹرویو لیا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ وہ کیوں تنہا رہتی ہیں اور ادب میں انھیں وہ مقام نہیں دیا گیا جن کی وہ حق دار ہیں۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی کے انسان کا رشتہ اپنے آج سے زیادہ کل سے جڑا ہوا ہے۔ وقت کے بدلتے تناظر نے ایک تسلسل جو برقرار تھا، اسے مٹا دیا ہے۔ حال کے تہذیبی رویوں سے مخالفت کی ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے بھی مقالے میں الطاف فاطمہ کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے کسی حد تک مشکل الفاظ میں مگر ادبی لحاظ سے بہترین نثر تحریر کی ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ ماضی کو بیان کرتے ہوئے حال سے تقابل کیا ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ حالات اور واقعات کی نوعیت واضح کرنے میں قرآنی آیات کا سہارا لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں طنز کی کاٹ بھی نظر آتی ہے۔

اس مقالے میں ان کے تین فنی اوصاف کا جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ تخلیقی اور افسانوی فقرہ بنانے کا ہنر جانتی ہیں۔ بالائی طبقے کی مصنوعی زندگی اور خود ساختہ زندگی کے متوازی حقیقی بھری پری اور بے ساختہ زندگی کے لیے بے پناہ رغبت رکھتی ہیں۔ مگر اس میں شمولیت کا انھیں حوصلہ نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اکثر افسانوں کے کرداروں کا نفسیاتی ابتلا فضا کے تاثر کو بڑھا دیتا ہے۔ تیسرا ان کے ہاں ہر طرح کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے میں تقسیم ہند کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فسادات میں پیش آنے والے واقعات و حالات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنفہ کو ہندوستان میں ایک کشش محسوس ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے وہاں بچپن گزارا تھا۔ وہ مستقل مضطرب اور بے چین رہتی ہیں۔ یاد ماضی بار بار نظر آتا ہے۔ ناسٹلجیا کے فکری عناصر پر غور کیا جائے تو چند ایک فکری

عناصر میں : عصری صورت حال کی تلخی، ہجرت، لاشعور کی کارفرمائی، مسرت و سکون کی تلاش، تشخص کی تلاش، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ورثے سے دوری، انسانی رشتوں کا انہدام۔ قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی حالات اور بے یقینی، لاتعلقی اور بے جڑ ہونے کا احساس شامل ہے۔ انھی عناصر کی روشنی میں مصنفہ کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس مقالے میں بہت سے ایسے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو ناسٹلجیائی رجحان کی عمدہ مثال ہے۔ ان کے افسانوں کے ہیرو جیسے سکندر بخت، شہر بانو، مچھلی اس کا دوست، نرگس، نور بانو جیسے کردار ناسٹلجیا کے ساتھ اپنا مکان بنا کر مقامی جڑوں سے اتصال کی کہانی ہے۔ ان افسانوں میں ان تمام مسائل کا تذکرہ ہے جو ہجرت کر کے پاکستان بسنے والوں کو پیش آئے۔ یہ یادیں ان کا سرمایہ ہیں جن سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکے۔

اس مقالے میں ہمارے معاشرے کی خود غرضی، بے حسی، منافقت اور مادیت پرستی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ اونچی اونچی دیواریں بنالی گئی ہیں۔ معلوم نہیں آس پاس کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ علاقے کا کمیونی کیشن سسٹم ختم ہو گیا ہے۔

دورانِ تحقیق حقیقت نگاری کا عنصر بھی الطاف فاطمہ کی تحریروں میں بدرجہ جرائم دیکھا گیا ہے۔ حالات و واقعات کو حقیقت سے نہایت قریب رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ بعض جگہ پر تخلیقی کردار و واقعات ہیں مگر تہذیب و ثقافت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے حقیقت سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے ساتھ منظر نگاری میں بھی کمال مہارت سے کام لیا ہے۔ نور بانو کا کردار بیان کرتے جنگل کا خوبصورت منظر، گاؤں کی تہذیب بیان کرتے ہوئے اور تلخ واقعات کی منظر نگاری بھی جانفشانی سے کی ہے۔

اس مقالے میں الطاف فاطمہ قرآنی آیت مبارکہ کی روشنی میں حال میں پھیلتی برائیوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے نظریات کے مطابق ہم مادیت کے پیچھے بھاگ کر اخلاقی طور پر پیچھے رہ گئے ہیں۔ "ننگی مرغیاں" افسانے میں وہ بازار میں جب ریشمی لباس کو دیکھتی ہیں تو انھیں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ تبدیلی کی چاہ میں وہ اخلاقی برائیوں میں ملوث ہو گئے ہیں۔ حال کی غلطیوں کو ہم ماضی کی روایات کی روشنی میں سدھار سکتے ہیں۔ ماضی کی تہذیب و ثقافت، روایات و اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ الطاف فاطمہ کے نظریات کے مطابق ہم آج ان برائیوں میں گھر گئے ہیں جو قوموں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔

اس مقالے میں الطاف فاطمہ کی معاشرتی اصلاح کے جذبے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے حقیقت کی آنکھ سے انسان اور انسانی مسائل کو دیکھا اور انھوں نے عالمگیر حقائق کو مشاہدے اور اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر افسانوں میں پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ مادیت، ترقی کی دوڑ میں انسان کے بھاگنے سے معاشرے میں جھوٹ، فریب، مکاری اور

منافقت عام ہو گئی کیونکہ ہمارے معاشرے میں تہذیب و ثقافت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان صرف مادی چیزوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے مگر الطاف فاطمہ نے قنوطیت کا اظہار نہیں کیا بلکہ رجاعی انداز نظر آتا ہے۔

الطاف فاطمہ انسانی دوستی، ہمدردی، احساس اور پاکستانی تہذیب و ثقافت، روایات اور اقدار سے محبت کرنا بھی سکھاتی ہیں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں پنجاب، ہندوستان کے دیہات سمائے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں پنجابی زبان کے الفاظ و محاورات استعمال کر کے ان پڑھ افراد کے کردار اور نفسیات کی عمدہ منظر کشی کی ہے۔ ان پڑھ انسان شام میں جہاں سب مل کر رہتے ہیں۔ ہر سو محبت کا بسیرا تھا۔ امن و سکون تھا، دیہات کی تہذیب و ثقافت اس انداز سے بیان کی ہے کہ قاری نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف گھر سے گھر تک کا ماحول ہے بلکہ ماضی میں آس پاس اور گرد و پیش کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ حال کا تقابل کر کے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی تہذیب و ثقافت کے مٹنے سے حال کی کوئی خبر نہیں ہے۔ دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس مقالے میں الطاف فاطمہ کے افسانوں کے کچھ ایسے کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو ماضی میں انتہائی سادہ تہذیب پسند اور حال میں وقت کے بدلتے تقاضوں کے ساتھ خود کو بدل کر تہذیب سے دور ہو گئے ہیں اور دو کرداروں کا تقابل بیان کیا گیا ہے۔ "خستہ خانم" افسانے میں لیلیٰ کا کردار بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اس مقالے میں حال کی بد سکونی، فسادات اور ماضی کے امن و سکون کا ذکر کیا گیا ہے۔ "امن کی فاختائیں" افسانے میں حال کے ہنگاموں سے گھبرا کر ہمیشہ ماضی میں کردار پناہ لیتے ہیں۔ ماضی میں تمام بزرگ افراد مل جل کر رہتے تھے۔ امن و سکون، شانتی تھی لیکن حال میں ساتھ والے گھر والوں کی خیر خبر نہیں ہے۔ سماجی شعور نظر آتا ہے۔

بحیثیت مجموعی الطاف فاطمہ کے ہاں ہمیں ناسٹلجیائی عناصر نظر آتے ہیں۔ ان کا فن، ان کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔ وہ ہمیشہ زندگی کے مثبت اور روشن پہلو کی جانب دیکھتی ہیں۔ تہذیب و ثقافت، روایات، اقدار کے ختم ہونے کے باوجود ان کے ہاں رجاعی انداز نظر آتا ہے کیونکہ وہ ان روایات، اقدار کو اس انداز سے پیش کرتی ہیں کہ دل سے عزت کرنے کی جی چاہتا ہے۔ زندگی کو ایک ہمدرد کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے دل میں اتر جانے والے الفاظ استعمال کرتی ہیں۔ ذاتی مطالعہ بھی وسیع ہے اور تہذیب و ثقافت، روایات، اقدار کا تصور بھی وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ قدیم تہذیب و ثقافت کو موثر انداز میں پیش کیا ہے اور جدید تہذیب و ثقافت، سماجی و معاشرتی زندگی کے مختلف زاویوں پر بھی ناقدانہ نگاہ رکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں کرداروں کی شخصیت سے مخصوص ذہن، مزاج اور ماحول جھلکتا ہے۔ قدیم اور جدید تہذیب و ثقافت کا تقابل موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتابیات

کتابیات

احمد، عزیز۔ ترقی پسند ادب۔ ملتان: کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء۔

احمد، انوار۔ اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء۔

اختر، جاوید۔ اردو کی ناول نگار خواتین۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔

اختر، سلیم۔ نفسیاتی تنقید۔ لاہور: مجلس ترقی کلب روڈ، ۲۰۰۱ء۔

اشرف، خالق۔ برصغیر میں اردو ناول۔ نئی دہلی: اردو مجلس، ۱۹۹۴ء۔

اللہ، آمنہ ثناء۔ احمد مشتاق بحیثیت شاعر (مقالہ ایم۔اے اردو) فیصل آباد: جی۔ سی۔ یونیورسٹی، س۔ن۔

الماس، روبینہ۔ اردو افسانے میں جلاوطنی کا اظہار۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۳ء۔

آصف، تسنیم۔ الطاف فاطمہ کی ناول نگاری: فکر و فن کا جائزہ (مقالہ ایم۔ایس اردو) اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء۔

بٹ، محمد عاصم۔ عبداللہ: شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

بریلوی، عبادت۔ "اردو ادب میں جدید رجحانات" مشمولہ مقالاتِ سرسید۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۳ء۔

پراچہ، احمد۔ پاکستان اردو ادب اور اہلِ قلم خواتین۔ حیدر آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱ء۔

پوری، فرمان فتح۔ اردو کا افسانہ اور افسانہ نگار۔ سندھ: اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء۔

پوری، فرمان فتح۔ اردو کا افسانوی ادب۔ ملتان: بیکن بکس گل گشت، ۱۹۸۸ء۔

جاوید، قاضی۔ "ناسٹلجیا کے بارے میں چند باتیں" مشمولہ ماہ نو۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

حسن، سبط۔ ماضی کے مزار۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء۔

حسن، سبط۔ تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء۔

حسین، عبداللہ۔ اداس نسلیں۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۲ء۔

حسین، انتظار۔ اردو کا مختصر افسانہ۔ پاکستان میں مطبوعہ سیپ ۱۲۔

حقی، شان الحق۔ مترجم آکسفورڈ اردو ڈکشنری۔ آکسفورڈ: پریس یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

حیدر، قراۃ العین۔ آگ کا دریا۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔
حیدر، قراۃ العین۔ خصوصی مطالعہ۔ مرتبین: سید عامر سہیل۔ ڈاکٹر علی اطہر۔ ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء۔
خان، ممتاز احمد۔ آزادی کے بعد اردو ناول کے چند اہم زاویے۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۷ء۔
خاکی، مسعود رضا۔ اردو افسانے کا ارتقا۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۰ء۔
خان، نگہت ریحانہ۔ اردو افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ۔ لاہور: ایجوکیشنل ہاؤس، ۱۹۸۶ء۔
سدید، انور۔ مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔
سدید، انور۔ مختصر اردو افسانہ کی کروٹیں۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء۔
سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں (ابتدائے اردو سے ۱۹۷۵ء تک) کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۹۹ء۔
سلیم، اختر۔ افسانہ اور افسانہ نگار۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔
عنصر، فوزیہ۔ الطاف فاطمہ کی افسانہ نگاری (مقالہ ایم۔ اے اردو)۔ اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۱۷ء۔
فاطمہ، الطاف۔ "شہاب صاحب کے خاندانی پس منظر کی ایک جھلک" مشمولہ الزبیر۔ بہاول پور: پنجاب یونیورسٹی۔
فاطمہ، الطاف۔ وہ جسے چاہا گیا۔ لاہور: دی مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۶۹ء۔
فاطمہ، الطاف۔ جب دیواریں گریہ کرتی ہیں۔ کراچی: دی سمیع پرنٹرز، ۲۰۰۳ء۔
فاطمہ، الطاف۔ گواہی آخر شب کی۔ لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔
فیض، فیض احمد۔ نسخہ ہائے وفا (نقشِ فریادی)۔ لاہور: مکتبہ کارواں، سن ندارد۔
ناز، اقلیمہ۔ الطاف فاطمہ کے افسانوں میں ماضی پسندی کے عناصر" مشمولہ خیابان۔ پشاور: جامعہ پشاور خزاں، ۲۰۱۴ء۔
نسیم، نگہت۔ الطاف فاطمہ جنھیں اہلِ ادب کی اکثریت ان کی زندگی میں ہی بھول گئی۔ اسلام آباد: عالمی اخبار، ۲۰۱۸ء۔
یلدرم، سید سجاد حیدر۔ "جہاں پھول کھلتے ہیں" مشمولہ سجاد حیدر یلدرم مرتبہ: قراۃ العین حیدر۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔
یوسفی، مشتاق احمد۔ آبِ گم۔ کراچی: مکتبہ دانیال، بار ششم، ۲۰۰۵ء۔
Advanced Practical Dictionary (English to English and Urdu) with brief general knowledge, Lahore:azhar Publishers,

Pakistan

David B. Guralnifon, websters, *New word Dictionary of the American language*, David B.Guralniform, New York & Cleveland: the word publishing company.

Websites:

www.wikipedia.org/wiki/nostalagia

www.medicalnewsday.com

www.nostalagia.com

www.oxforddictionary.com

www.urbandictionary.com

www.urduvoa.com.art.pk

www.medicalnewsday.com

www.urbandictionary.com

dictionary.cambridge.org/dictionary

http://www.facebook.com/550483888344619/posts/2201306503262342/?appfbl

http://www.facebook.com/550483883446191/posts/3460848317308147/?app=fbl

www.allencounlyky.com/infor/old.disease.html